ذوالقعدہ ۱۴۳۹ھ ۔ محرم الحرام ۱۴۴۰ھ
جولائی ۔ ستمبر ۲۰۱۸ء

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

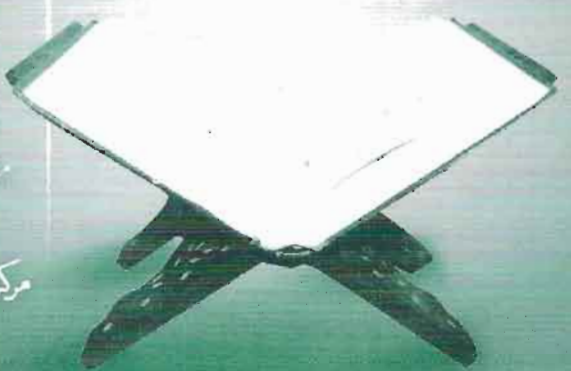

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

داعی رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیان القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

خاص ایڈیشن

- دیدہ زیب ٹائٹل
- امپورٹڈ آفسٹ پیپر
- بڑے سائز میں
- عمدہ طباعت
- مضبوط جلد

سات جلدوں پر مشتمل

مکمل سیٹ کی قیمت: 4000 روپے

عوامی ایڈیشن

- کتابی سائز
- پیپر بیک بائنڈنگ
- امپورٹڈ بک پیپر
- عمدہ طباعت
- دیدہ زیب ٹائٹل

چھ جلدوں پر مشتمل

مکمل سیٹ کی قیمت: 2200 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا (البقرۃ: ۲۶۹)

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

جلد ۳۷ شمارہ ۳

ذوالقعدہ ۱۴۳۹ھ ـ محرم الحرام ۱۴۴۰ھ جولائی ـ ستمبر ۲۰۱۸ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ـ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہما

مدیر مسئول: ڈاکٹر ابصار احمد

مدیر: حافظ عاطف وحید

نائب مدیر:
حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر حافظ محمد زبیر ـ مؤمن محمود
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

یکے از مطبوعات مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور ـ فون 3-35869501

ویب سائٹ : www.tanzeem.org

ای میل : publications@tanzeem.org

سالانہ زرِتعاون : 240 روپے، فی شمارہ :60 روپے

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

دینی نصابِ تعلیم اور تحریک رجوع الی القرآن	حافظ عاطف وحید	3

تذکّر و تدبّر

مِلاكُ التأويل(۱۴)	ابوجعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی	11

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح	افاداتِ حافظ احمد یارؒ	25

حکمتِ نبویؐ

تقویٰ: اُخروی محاسبے کا خوف	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	35

قرآنیات

کتابتِ مصاحف اور علم الرسم (۲)	پروفیسر حافظ احمد یارؒ	38

حُسنِ معاشرت

اسلامی ضابطۂ میراث واستحقاقِ میراث	پروفیسر حافظ قاسم رضوان	54

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دینی نصابِ تعلیم اور تحریک رجوع الی القرآن

شاعرِ مشرق نے اپنی شہرہ آفاق نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں ابلیس کی زبانی اس کے مشیروں سے خطاب میں عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ایک نوع کا اندیشہ ظاہر کیا ہے' اور وہ یہ کہ یہ تقاضے شریعتِ محمدی ﷺ کی حقیقتِ اصلی کے ظاہر و باہر ہونے کا ذریعہ نہ بن جائیں۔ بادیٔ النظر میں یہ صورتحال عصرِ حاضر کے تقاضوں کی بعض ایجابی منفعتوں کا اثبات ہے' لیکن دینی نصابِ تعلیم کے ضمن میں اس کے اثرات کا تخمینہ قدرے مختلف ہے۔ دینی تعلیم کا مروّجہ نصاب' الموسوم بہ درسِ نظامی' متداول مسالک کے مراکزِ دینیہ میں معمولی فرق کے ساتھ یکساں طور پر رائج ہے۔ بیشتر مراکز اپنے اپنے وفاق کے ساتھ ملحق ہیں' جبکہ بعض ادارے ذاتی حیثیت میں مسلم ہیں اور الحاقی ضرورتوں سے مستغنی۔ مفصل نصاب کے ساتھ ساتھ عصری دباؤ نے مختصر دورانیے کے نصاب بھی متعارف کروائے ہیں' جنہیں بنیادی دینی تعلیم کا ذریعہ تو قرار دیا جاسکتا ہے' ان کا علومِ دینیہ تک رسائی یا دسترس کی توقعات پر پورا اترنا بعید از قیاس ہے۔

درسِ نظامی کے نصاب میں کیا اور کیسے بہتری لائی جاسکتی ہے.....اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ تاہم ناقدین اور مجوزین کے لیے اس تعلیمی نصاب کے مقاصد سے آگہی ضروری ہے جو گہرے فکر و تجربے اور سوجھ بوجھ سے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔

حال ہی میں بعض تحریریں نظر سے گزری ہیں جن میں پیش کردہ تجزیئے مخلصانہ قرار دیے جانے کے باوجود نہ صرف یک رخے ہیں بلکہ شدید سطحیت کا بھی شکار ہیں۔ ان تجزیوں میں اُمت کی موجودہ زبوں حالی کا واحد سبب درسِ نظامی کے نصاب کو قرار دیا گیا ہے اور اس پستی کا علاج یہ تجویز کیا گیا ہے کہ اس نصاب کو مکمل طور پر ترک کر قرآن حکیم پر توجہات کو مرتکز کیا جائے۔

ہماری دانست میں ان تجزیوں میں پیچ در پیچ مغالطے شامل ہیں۔ اصلاحی تجاویز اپنی جگہ' خود درسِ نظامی سے وابستہ متعدد غلط فہمیاں ہیں جن کا ازالہ ضروری ہے۔ سب سے نمایاں غلط فہمی اس درسی نصاب کی قرآن حکیم سے لاتعلقی اور بے اعتنائی کا الزامی دعویٰ ہے۔ اس ضمن میں چند اصولی باتیں توجہ میں رکھنا مفید ہوں گی۔

بلاشبہ قرآن حکیم وہ کتابِ ہدایت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد ﷺ پر نازل فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت اسی بات کی مقتضی ہوئی کہ بجائے ہر ہر شخص کو براہِ راست وحی بھیجنے کے' ایک رسولِ بشر کی

جانب وحی نازل فرمائی اور رسول کو اس بات کا ذمہ دار بنایا کہ وحی کی تلاوت‘ تعلیم اور اس کی لازوال حکمتوں کا بیان ہو۔ چناں چہ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ (آل عمران)

اس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔ بعثتِ رسول میں ہی یہ حکمت پنہاں ہے کہ قرآن مجید کے علوم کا کما حقہٗ ابلاغ رسول کے بغیر مفید نہیں ہوگا۔ حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اہل زبان تھے‘ عربی میں نازل ہونے والے قرآن کو سمجھ سکتے تھے‘ لیکن پھر بھی فرمایا اور تاکیداً فرمایا کہ رسول تمہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی وہ تشریح اور تعبیر معتبر ہے جو رسول اللہ ﷺ سکھائیں‘ اور رسول کے بتائے بغیر کتاب اللہ کی اصل منشاء کو سمجھنا لوگوں کی اہلیت وصلاحیت کے اعتبار سے ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو اپنے اقوال وافعال اور روز وشب کے معمولات کے ذریعے کتاب اللہ کی تعلیم دی۔ یہی تعلیمات سنّت وحدیث کہلاتی ہیں۔ قرآنی اصطلاحات سے واقفیت‘ محاورات کی وضاحت‘ مسائل فقہ کی تفصیل اور مجملات کی توضیح سنت وحدیث کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی لیے علومِ دینیہ میں علمِ حدیث نمایاں مقام رکھتا ہے‘ لیکن یہ اہمیت اصلاً شارعِ حقیقی کی منشاء کے حصول کی غرض سے ہی ہوتی ہے‘ اس سے جدا نہیں ہے۔

بعض لوگوں کو یہ مغالطہ ہو جاتا ہے کہ احادیث کا معاملہ نازک اور پُرخطر ہے کہ ان میں ضعیف روایات بھی ہیں اور موضوع بھی۔ اس بارے میں یہی کہنا کافی ہے کہ صرف اس بنا پر علم حدیث سے استغناء برتنا اور قرآن مجید کو محض عقل ومنطق سے سمجھنے کی کوشش کے نتائج کیسے ہوں گے؟ تاریخی طور پر یہ بات مسلم ہے کہ ایسی تمام کوششیں گمراہی اور خروج عن الملۃ کا ذریعہ بنی ہیں۔ چنانچہ امت میں سب سے پہلے جس گمراہ فرقے کی بنیاد پڑی وہ خوارج کا فرقہ ہے‘ جو یہ سمجھتے تھے کہ ہم ہی قرآن کے اصل داعی اور علمبردار ہیں۔ اس طبقے نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو گمراہ کہا اور اپنے سوا سب کی تکفیر کر دی۔ دورِ حاضر میں بھی بعض لوگ ’’اہلِ قرآن‘‘ ہونے کے مدعی ہیں اور وہ گمراہ ہوئے‘ یہاں تک کہ ختمِ نبوت اور حدیث وسنت کے انکار کرنے والے بن گئے۔ یہ تقاضا کرنا اور دعویٰ کرنا کافی نہیں ہے کہ قرآن کو اہمیت دو‘ بلکہ یہ دعویٰ اور یہ تقاضا تب نتیجہ خیز ہوسکتا ہے جب قرآن کی اہمیت کو اس نہج پر قبول کیا جائے جس کا حکم ہے۔ سنن ابی داؤد کی روایت ہے جس میں اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: ’’تم لوگ مجھ سے سنتے ہو (دین سیکھتے ہو)‘ لوگ تم سے سنیں گے‘ اور پھر ان سے سنا جائے گا جو تم سے سنتے ہیں‘‘۔ یہ تعلیم کا فطری طریقہ ہے‘ اس میں سند اور استاد کی اہمیت ہے۔ بغیر سند اور استاد کے دین سیکھنا خطرات سے خالی نہیں اور یہ طریقہ رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف بھی ہے۔ چنانچہ تابعین میں سے قرآن و سنت کے ایک بہت بڑے عالم عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں: **الاسناد من الدِّین ، ولولا الاسناد لقال من شاء ما شاء** یعنی سند دین کا حصہ ہے‘ اور اگر سند نہ ہوتی تو جو شخص بھی جو چاہتا کہہ دیتا۔ گھر بیٹھے کتابوں اور

انٹرنیٹ کی مدد سے حاصل کیے گئے علم کا کوئی اعتبار نہیں۔ حصولِ علم کے صحیح ذریعے کا نام سند ہے اور یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن مجید کے سیکھنے اور سکھانے کو افضل ترین عمل قرار دیا اور علماء کو اپنا وارث قرار دے کر ان کے مقام و مرتبہ کی تعظیم و تشریف فرمائی۔

موجودہ درسِ نظامی کے نصاب سے لاعلمی کا ایک واضح ثبوت یہ اشکال ہے کہ ''درس نظامی میں دورۂ حدیث تو پڑھا پڑھایا جاتا ہے' دورۂ قرآن نہیں پڑھایا جاتا''۔ یہ اشکال اس پر دلیل ہے کہ نصاب میں قرآن کا content کم ہے اور یہ امر بالآخر فروغِ مسلکیت کا باعث ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ نصاب میں درجہ ثانیہ سے لے کر درجہ سابعہ تک طلبہ کی استعداد کی مناسبت سے ہر سال قرآن حکیم نصاب میں شامل ہے۔ درجہ ثانیہ میں آخری پارہ تجوید و تفسیر کے ساتھ' ثالثہ میں آخری دس پارے' رابعہ میں درمیانی دس پارے' خامسہ میں پہلے دس پارے' سادسہ میں تفسیر جلالین (مکمل) اور سابعہ میں تفسیر بیضاوی کا کچھ حصہ شامل ہے۔ اس پر مستزاد ہے بعد تکمیل دورۂ تفسیر جو ہر بڑے دارالعلوم کا اپنا اپنا اختصاص ہے۔ اس تفصیل کے بیان سے ہمارا مقصد اس مغالطے کی اصلاح ہے جو قرآن حکیم کو اس نصابِ تعلیم سے خالی قرار دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ نصاب میں شامل دیگر علوم و فنون: صَرف' نحو' ادب' بلاغت' اصولِ فقہ' اصولِ تفسیر وغیرہ صرف معیارِ فضیلت ہی نہیں سمجھے جاتے بلکہ علومِ قرآن و حدیث کے بنیادی ذرائع و وسائل بھی ہیں۔

ایک مغالطہ یہ بھی پھیلایا گیا ہے کہ موجودہ نصابِ درس نظامی دورِ سلجوقی کے نظام الملک طوسی کے قائم کردہ مدرسہ نظامیہ سے ماخوذ ہے۔ یہ مغالطہ التباسِ لفظی کا نتیجہ ہے' جو بارہویں صدی ہجری کے ملا نظام الدین سہالوی لکھنوی کے نام سے پیدا ہوا۔ اس لیے کہ درسِ نظامی کی نسبت ملا نظام الدین سہالوی لکھنوی کی جانب تو کسی حد تک مسلّم ہے' البتہ نظام الملک طوسی کی طرف ثابت شدہ نہیں۔ ذیل میں ایک تحقیق پیش ہے جو ہندوستان کے ایک سکالر محمد اللہ خلیلی قاسمی نے ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نصابِ تعلیم'' کے عنوان سے نہایت عرق ریزی سے تالیف کی ہے۔ نصابِ تعلیم کی اسلامی تاریخ کو sum-up کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اسلام نے روزِ اوّل ہی سے علم کی اہمیت پر زور دیا اور مسلمانوں کو تعلیم جیسی دولت بے بہا کو حاصل کرنے کی تاکید کی۔ ابتدائے عہدِ اسلام میں جبریل امین علیہ السلام کے واسطہ نازل ہونے والا الٰہی فرمان اور دربارِ نبوت سے صادر ہونے والے الفاظ و اعمال یعنی قرآن و حدیث ہی مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کا نصاب تھا۔ قرآن کی موقعہ بہ موقعہ نازل ہونے والی آیات کو لکھنے' پڑھنے اور یاد کرنے کا خاص التزام کیا جاتا تھا۔ حدیث کے مذاکرہ کا رواج تھا' کچھ صحابہ حدیث کو لکھنے کا بھی اہتمام کرتے تھے۔

نبی اکرم ﷺ کے بعد صدیقی دورِ خلافت میں قرآن کریم کی تدوین کی طرف توجہ ہوئی اور اسے ایک مصحف میں نہایت اہتمام و احتیاط کے ساتھ جمع کیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اسلامی مملکت کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا اور اسلام عرب سے نکل کر بلادِ عجم تک پہنچ گیا اور نت نئی تبدیلیاں واقع ہونے لگیں۔ چناں چہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جملہ شعبہ ہائے حیات اور خصوصاً شعبۂ تعلیم میں زبردست انقلابی

تبدیلیاں کیں اور ترقیات کی بنیاد ڈالی۔

پہلی صدی ہجری میں احادیثِ مبارکہ کی تدوین کا سلسلہ شروع ہوگیا اور اس کے بعد کی دو صدیاں تدوین و ایجادات کی صدیاں ثابت ہوئیں۔ خلافت اسلامیہ کے بعد اموی و عباسی ادوار میں اسلام دنیا کے متمدن علاقوں تک پہنچ چکا تھا۔ دین اسلام کے بڑھتے دائرہ اور نت نئے مسائل و واقعات کے پیش نظر حرفتوں' علوم اور فنون کی تدوین و ایجاد شروع ہوئی۔ قرآن و حدیث کے معانی و مطالب کو سمجھنے کے لیے عجمیوں کو نحو و صرف جیسے علوم کی ضرورت ہوئی اور یہ علوم ایجاد ہوئے' ادباء و علمائے نحو پیدا ہوئے۔ ترقیات کی کثرت اور عالمِ اسلام کی وسعت کے لحاظ سے نئے مسائل و حالات پیدا ہوتے رہے اور علماء و فقہاء کی ایک بڑی تعداد قرآن و حدیث کی روشنی میں ان مسائل و حالات کے حل نکالنے میں مشغول ہوئی۔ اس طرح فقہ و اصولِ فقہ کی تدوین عمل میں آئی اور تفسیر و اصولِ تفسیر' حدیث و اصولِ حدیث' فقہ و اصولِ فقہ' صرف و نحو' اسماء الرجال اور تواریخ و معاجم کے متعلق علوم کی کتابیں لکھی جانے لگیں۔

اُس وقت تک مساجد اور درسی حلقات کے بنیادی نصاب میں یہی قرآن و حدیث اور اس سے متعلق علوم نصاب کا جزو رہے۔ پانچویں صدی میں امام غزالی نے یونانی فلسفہ کے زیر اثر پیدا ہونے والے اسلام مخالف اَفکار و نظریات کے رد میں علم کلام کو اختیار کیا جس سے اسلامی فلسفہ اور منطق کا رواج ہوا۔ یہ علوم اُس وقت اور اس کے بعد کے تقریباً تمام ہی عالم اسلام کے خطوں میں مشترک تھے' لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا مختلف اسباب و وجوہات کی بنیاد پر مختلف علاقے مختلف علوم کے ساتھ مشہور ہوتے گئے۔ جیسے عرب کے علاقے میں تفسیر' حدیث' اصولِ حدیث اور اَسماء الرجال جیسے علوم سے زیادہ شغف رہا۔ اسلامی اندلس میں تاریخ' ادب اور شاعری زیادہ مرغوب رہی' جب کہ ایران کے لوگ منطق و فلسفہ سے دلچسپی میں ہمیشہ ممتاز رہے۔ اسی طرح خراسان و ماوراء النہر (وسط ایشیا) میں بعد کی صدیوں میں فقہ' اصول فقہ اور تصوف کا خوب رواج رہا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اموی خلافت کے دور میں پہلی صدی ہجری کے اندر ہو چکی تھی اور محمد بن قاسم کے ہاتھوں سندھ و ملتان فتح ہو چکے تھے۔ اسی طرح پانچویں صدی ہجری میں سلطان محمود غزنوی نے سندھ و پنجاب کو زیر نگیں کر لیا تھا اور اپنی فتوحات کا دائرہ گجرات تک وسیع کر لیا تھا' لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کی ابتدا دراصل چھٹی صدی ہجری (مطابق ۱۲۰۶ء) کے اخیر میں سلطان شہاب الدین غوری کے نائب قطب الدین ایبک کے دور سے ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وسط ایشیا کے مسلمان تفسیر و حدیث کے ساتھ صرف و نحو' بلاغت و ادب اور کلام و تصوف کو بھی اہمیت دینے لگے تھے۔ چونکہ وسطِ ایشیا اور دیگر اسلامی ملکوں میں تاتاری حملوں کے بعد مضبوط اسلامی حکومت ہندوستان میں ہی قائم ہوئی تھی اور یہ علاقہ تاتاری یورشوں سے تقریباً آزاد تھا' اس لیے ان علاقوں کے علماء و مشائخ اور عام مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہندوستان آ گئی تھی۔ چنانچہ فطری طور پر ان کے ساتھ یہ ذوق ہندوستان منتقل ہوا اور یہیں سے ہندوستانی نظام تعلیم کی بنیاد پڑی۔

مولانا حکیم سید عبدالحئی لکھنوی نے اپنے ایک مقالے 'ہندوستان کا قدیم نصاب درس اور اس کے

تغیرات' میں قدیم ہندوستانی نصاب تعلیم کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ذیل میں اسی بنیاد پر اختصار کے ساتھ عہدِ وسطیٰ میں ہندوستانی مسلمانوں کے نصابِ تعلیم کا ایک خاکہ پیش کیا جارہا ہے:

پہلا دور: اس کا آغاز ساتویں ہجری سے سمجھنا چاہیے اور انجام دسویں صدی پر اس وقت ہوا جب کہ دوسرا دور شروع ہوگیا تھا۔ کم وبیش دوسو برس تک اِن فنون کی تحصیل معیارِ فضیلت سمجھی جاتی تھی: صرف' نحو' ادب' بلاغت' فقہ' اصول فقہ' منطق' کلام' تصوف' تفسیر' حدیث۔ اس طبقے کے علماء کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں علم فقہ معیارِ فضیلت تھا' حدیث میں صرف 'مشارق الانوار' کا پڑھ لینا کافی سمجھا جاتا تھا اور حدیث میں مزید درک ومہارت کے لیے 'مصابیح' آخری کتاب تھی۔ اس زمانے کے نصاب تعلیم میں جو خصوصیات نظر آتی ہیں وہ فاتحین ہند کے مؤثر اور نکھرے ہوئے مذاق کا نتیجہ تھیں۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کی بساط جن لوگوں نے بچھائی' وہ غزنی اور غور سے آئے تھے۔ یہ وہ مقامات تھے جہاں فقہ اور اصول فقہ کا ماہر ہونا علم وفن کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا اور ان ممالک میں فقہی روایات کا پایہ بہت بلند تھا۔

دوسرا دور: نویں صدی ہجری کے آخر میں شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ ملتان سے دہلی سلطان سکندر لودھی کے دربار میں آئے اور انھوں نے سابقہ معیارِ فضیلت کو کسی قدر بلند کرنے کے لیے قاضی عضدالدین کی تصانیف 'مطالع' و 'مواقف' اور علامہ سکاکی کی 'مفتاح العلوم' نصاب میں داخل کیں۔ اس دور میں میر سید شریف کے تلامذہ نے 'شرح مطالع' اور 'شرح مواقف' اور علامہ تفتازانی کے شاگردوں نے 'مطول ومختصر المعانی' اور 'تلویح وشرح عقائد نسفی' کو رواج دیا۔ نیز اس زمانہ میں 'شرح وقایہ' اور 'شرح جامی' داخل نصاب کی گئیں۔ اس دور کے آخر میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے علمائے حرمین شریفین سے علم حدیث کی تکمیل کر کے علم حدیث کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ ان کے بعد ان کے فرزند شیخ نورالحق نے بھی درس حدیث کی اشاعت کی کوشش کی۔ اس طبقے کے علمائے کرام کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں 'مفتاح العلوم' سکاکی اور قاضی عضدالدین کی 'مطالع' اور 'مواقف' منتہیانہ کتابیں تھیں۔

تیسرا دور: دسویں صدی کے اخیر میں میر فتح اللہ شیراز (ایران) سے ہندوستان آئے' اکبر نے ان کو عضد الملک کا خطاب دے کر پذیرائی کی۔ انہوں نے سابق نصاب درس میں کچھ معقولی کتابوں کے اضافے کیے اور انہی کے زیر اثر ہندوستانی نصاب میں ان کا رواج ہوا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ جو اس دور کے سب سے آخری مگر سب سے زیادہ نامور عالم تھے' حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہاں چودہ ماہ قیام فرما کر علم حدیث کی تکمیل کی اور ہندوستان آکر اس سرگرمی سے اس کی اشاعت کی کہ جس کے اثرات آج تک باقی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے اَخلاف نے صحاحِ ستہ کے درس وتدریس کو اپنی سعی و کوشش سے جزوِ نصاب بنا دیا۔ شاہ صاحب نے ایک نیا نصابِ درس بھی مرتب کیا تھا' مگر چونکہ اس زمانے میں علم کا مرکز دہلی سے لکھنو منتقل ہو چکا تھا' نیز ہمایوں اور اکبر کے زمانے میں ایران سے جو نیا تعلق ہوا تھا' اس نے بتدریج ہندوستان کے علمی مذاق میں ایک جدید تغیر پیدا کر دیا تھا۔ مغل دربار کے ایرانی امراء اور علماء کے ذریعے منطق اور فلسفہ کو آہستہ آہستہ دوسرے علوم پر فوقیت حاصل ہوتی گئی' اس لیے شاہ صاحب کے نصاب کو قبولِ عام حاصل نہ ہوسکا۔

چوتھا دور: چوتھا دور بارہویں صدی ہجری سے شروع ہوا' اس کے بانی ملا نظام الدین سہالوی لکھنویؒ تھے جن کا مرکز فرنگی محل لکھنؤ تھا۔ درس نظامی کے نام سے جو نصاب آج تمام مدارسِ عربیہ میں رائج ہے وہ ان ہی کی یادگار ہے۔ ملا نظام الدین نے دورِ سوم کے نصاب میں اضافہ کر کے ایک نیا نصاب مرتب کیا اور اس دور میں پڑھائی جانے والی کتابوں کو حتی الامکان جمع کرنے کی کوشش کی۔ درسِ نظامی میں تیرہ موضوعات کی تقریباً چالیس کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ فقہ اور اصول فقہ کے ساتھ' تفسیر میں 'جلالین' و 'بیضاوی' اور حدیث میں 'مشکاۃ المصابیح' داخل تھی۔ انھوں نے ریاضی اور فلکیات کی کئی کتابیں اور ہندسہ (انجینئرنگ) پر بھی ایک کتاب شاملِ نصاب کی۔ اس میں طب' تصوف اور ادب کی کوئی کتاب شامل نہیں تھی اور منطق و فلسفہ کو خاصی جگہ دی گئی۔

تیرہویں صدی کے وسط میں ہندوستان میں علم کے تین مرکز قائم تھے: دہلی' لکھنؤ اور خیرآباد۔ گو نصابِ تعلیم تینوں کا قدرے مشترک تھا' تاہم تینوں کے نقطہ ہائے نظر مختلف تھے۔ دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا خاندان کتاب وسنت کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تدریس میں ہمہ تن مشغول تھا' یہاں تفسیر و حدیث پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی' علومِ معقولہ کی حیثیت ثانوی درجے کی تھی۔ لکھنؤ میں علمائے فرنگی محلّی پر ماوراء النہر کا ساتویں صدی والا قدیم رنگ چھایا ہوا تھا' فقہ اور اصول فقہ کو ان کے یہاں سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی' تفسیر میں 'جلالین' و 'بیضاوی' اور حدیث میں صرف 'مشکاۃ المصابیح' کافی سمجھی جاتی تھی۔ خیرآبادی مرکز کا علمی موضوع صرف منطق و فلسفہ تھا اور یہ علوم اس قدر اہتمام سے پڑھائے جاتے تھے کہ جملہ علوم کی تعلیم ان کے سامنے ماند پڑ گئی تھی۔

۱۸۵۷ء کے تاریخی حادثۂ انقلاب میں تقریباً ملک سے ساری نامور درس گاہیں برباد کر دی گئیں اور خصوصاً ملک کا شمالی حصہ جو اس تحریک کا مرکز تھا اور دینی علوم و فنون کا گہوارہ تھا' اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ اس واقعہ کے تقریباً دس سال بعد جب دیوبند میں دارالعلوم کی بنیاد پڑی' اس کے نصاب میں ماضی قریب کے تینوں علمی گہواروں' دہلی' لکھنؤ اور خیرآباد' کی خصوصیات کو جمع کیا گیا۔ اس طرح اس میں درس نظامی کو بنیاد بناتے ہوئے 'صحاحِ ستہ' کو شامل کیا گیا۔ دارالعلوم دیوبند کا یہی نصابِ تعلیم تقریباً ڈیڑھ صدیوں سے ہندوستان کے اکثر مدارس میں مروّج ہے۔ دیوبند نے ان علوم کی عظمت کو نہ صرف یہ کہ باقی رکھا بلکہ ترقی دینے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اس نصاب کی خصوصیت یہ ہے کہ طالب علم میں امعانِ نظر اور قوتِ مطالعہ پیدا کرنے کا لحاظ اس میں زیادہ رکھا گیا ہے۔ اگرچہ اس نصاب کی تحصیل کے معاً بعد کسی مخصوص فن میں کمال حاصل نہیں ہوتا' مگر یہ صلاحیت ضرور پیدا ہو جاتی ہے کہ طالب علم محض اپنے مطالعہ اور محنت سے جس فن میں چاہے کمال پیدا کر لے۔

اس وقت دارالعلوم دیوبند اور اس کے طرز پر چلنے والے مدارس میں فضیلت تک تقریباً تیس موضوعات کی پچاس سے زیادہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان موضوعات میں تفسیر و ترجمۂ قرآن' حدیث و اصولِ حدیث' فقہ و اصولِ فقہ' نحو و صرف' معانی و بیان و بلاغت' منطق و فلسفہ' تاریخ و تصوف' عقائد و ادب اور تجوید وغیرہ جیسے علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ ابتدا کی چند کتابوں کو چھوڑ کر ساری کتابیں عربی زبان میں

ہیں۔ دورۂ حدیث کے بعد طالب علم کے ذوق وشوق اور اس کی صلاحیت کے مطابق اسے تفسیر واصولِ تفسیر، حدیث واصولِ حدیث، فقہ وفتاویٰ یا ادبِ عربی میں سے کسی ایک فن میں تخصص کی سہولت مہیا کی جاتی ہے اور اس سلسلے میں اس کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ کمپیوٹر، انگریزی وغیرہ کے بھی کورسز ہیں جو ان موضوعات سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ کو اس میدان میں آگے بڑھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے نصاب کو 'درسِ نظامی' کا نام دیا جاتا ہے' جو کسی حد تک صحیح کہا جاسکتا ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کو اس نام سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ یہ نصاب بعینہٖ بارہویں صدی ہجری کا ہے' حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ دارالعلوم کے اس نصاب کی بنیاد وہی درس نظامی تھا جو قیام دارالعلوم کے وقت عموماً ہندوستانی مدارس ودرس گاہوں میں رائج تھا' لیکن دارالعلوم کے قیام کی ابتدا ہی سے 'درسِ نظامی' جوں کا توں کبھی بھی نصاب نہیں رہا اور بعد میں حالات کے تقاضے کے پیش نظر اس میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اگر کوئی شخص مُلّا نظام الدین کے درس نظامی کا آج کے دارالعلوم دیوبند کے نصاب سے موازنہ کرے تو اسے دارالعلوم کے نصاب کو درس نظامی کا نام دینے میں بھی ہچکچاہٹ ہوگی' کیوں کہ اس میں علومِ عالیہ کے ساتھ علومِ آلیہ کی کتابوں میں بنیادی تبدیلیاں کی گئی ہیں' درسِ نظامی کی متعدد کتابوں کو بالکل نکال کر دوسری کتابوں کا اضافہ کیا گیا ہے' جب کہ بہت سے موضوعات کی کتابوں کو بدل دیا گیا ہے۔ نصابِ دارالعلوم میں زمانہ کے تقاضوں کے مطابق تغیر وتبدل اور حذف واضافہ کا عمل مسلسل جاری ہے۔ علوم دینیہ کے ساتھ عصری علوم اور معاشی ضرورتوں کا بھی لحاظ رکھا جارہا ہے۔ دارالعلوم میں دارالصنائع' شعبۂ کمپیوٹر' شعبۂ انگریزی وشعبۂ صحافت اسی مسلسل عمل کا ایک حصہ ہیں۔

نصاب کی تبدیلی کے سلسلے میں ایک بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ دارالعلوم دیوبند اور اس جیسے مدارس کا مقصد دینی علوم وثقافت کی حفاظت اور اسلام کی نشر واشاعت ہے' لہٰذا ایسی کوئی تبدیلی جو اس عظیم مقصد میں خلل انداز ہو' اسے قطعاً قبول نہیں کیا جاسکتا ہے۔ علومِ عالیہ یعنی قرآن' حدیث اور فقہ کو صحیح طور پر سمجھنے اور ان میں درک حاصل کرنے کے لیے جن علوم کی ضرورت ہوتی ہے' ان علوم کی تعلیم ہی ان مدارس کا اصل مقصد ہے۔ اس میں دوسرے علوم وفنون کی گنجائش محض اسی حد تک ہے جب تک کہ یہ دوسرے علوم ان مدارس کے اصل مقصد میں حائل یا مخل نہ ہوں۔'' (ماہنامہ دارالعلوم (انڈیا)' شمارہ:۵' جلد:۹۴' جمادی الاول۔ جمادی الثانی ۱۴۳۱ ہجری مطابق مئی ۲۰۱۰ء)

متذکرہ بالا بحث اور تاریخی منظر نامہ پیش کرنے سے یہ بات الم نشرح ہوکر سامنے آجاتی ہے کہ مسلمانوں کا دینی تراثِ علمی اللہ تعالیٰ کی مشیتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا مظہرِ کامل ہے۔ دین ہم تک پندرہ سو سال بعد بھی اپنی اصل حالت میں پہنچا ہے' یہ امر خود اس بات پر دلیل ہے کہ دینی نصابِ تعلیم کی ترتیب وتالیف میں وارثانِ نبوت ورسالت نے تعمیری ومخلصانہ کردار ادا کیا ہے' اور یہ سلسلہ ان شاء اللہ قیامت تک جاری رہنے والا ہے۔ مرکزی انجمن خدام القرآن کے بانی ومؤسس ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کو قرآنی دعوت کے فروغ اور حکم واقامتِ دین کی جدوجہد کے ضمن میں علمی وتعلیمی ضرورتوں کا شدت سے احساس تھا۔ چناں چہ ۶۸۔۱۹۶۷ء میں انہوں ماہنامہ ''میثاق'' کے ادارتی صفحات میں اپنے وقیع تجزیے پیش کیے اور آخر میں اُس مضمون پر اس سلسلے کا اختتام ہوا جو

بعد میں ''اسلام کی نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' کے عنوان سے شائع ہوا' جس میں احیائے اسلام کے لیے صحیح اور مثبت لائحۂ عمل کی نشان دہی کی گئی اور اسی کے ذیل میں ایک ''قرآن اکیڈمی'' کے قیام کی تجویز پیش کی گئی۔

مجوزہ قرآن اکیڈمی کے قیام کے مقاصد کی وضاحت میں ایک جگہ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

''.....ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اس اکیڈمی کا اصل کام ہوگا۔ اور اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ان کو پختہ بنیادوں پر عربی کی تعلیم دی جائے' یہاں تک کہ ان میں زبان کا گہرا فہم اور اس کے ادب کا ستھرا ذوق پیدا ہو جائے۔ پھر انہیں پورا قرآن حکیم سبقاً سبقاً پڑھایا جائے اور ساتھ ہی حدیثِ نبوی ﷺ' فقہ اور اصولِ فقہ کی تعلیم دی جائے۔ پھر ان میں سے جو لوگ فلسفہ و الٰہیات کا ذوق رکھنے والے ہوں گے ان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ قرآن حکیم کی روشنی میں جدید فلسفیانہ رجحانات پر مدلّل تنقید کریں اور جدید علمِ کلام کی بنیاد رکھیں۔ اور جو عمرانیات کے مختلف شعبوں کا ذوق رکھنے والے ہوں گے ان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام کی رہنمائی و ہدایت کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کر سکیں۔'' (اسلام کی نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام' صفحہ ۲۶)

قرآن اکیڈمی کے پہلے مرحلے میں 'دارالمقامہ' کی تعمیر کی گئی جہاں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اُن طلبہ کو رہائش کی پیشکش کی گئی جو اپنے اوقات میں سے دو گھنٹے دینی تعلیم کے پروگراموں میں شرکت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ بیان کردہ انہی مقاصد کے حصول کے لیے ''معہد ثانوی'' کے عنوان سے ایک تعلیمی منصوبہ شروع کیا گیا۔ یہ منصوبہ بوجوہ چل نہ سکا اور دو سال بعد بند کرنا پڑا۔ اس تجربے کے بعد ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے ایک نئی اسکیم کا آغاز کیا جو اعلیٰ تعلیم سے فارغ ہونے والے باصلاحیت نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اور قرآن اکیڈمی کے مقاصد کے حصول کے لیے ایک غیر معمولی اسکیم تھی۔ اسے ''قرآن اکیڈمی فیلوشپ اسکیم'' کا نام دیا گیا۔

اس اسکیم سے وابستہ نوجوانوں کو علومِ دینیہ کی تدریس کے لیے ماہر اہلِ علم کی خدمات حاصل کی گئیں۔ عربی زبان و ادب' فقہ' اصولِ فقہ' اصولِ تفسیر' ترجمہ و تفسیر اور دیگر علومِ دینی کی تدریس کے لیے پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر حافظ احمد یارؒ صاحب' شیخ الحدیث مولانا الطاف الرحمٰن بنوی صاحب' پروفیسر علامہ غلام شبیر بخاریؒ صاحب' پروفیسر مولانا عصمت اللہ صاحب اور ان کے علاوہ کئی نامور اصحابِ علم و دانش کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہ سلسلۂ تعلیم اب ''رجوع الی القرآن'' کے عنوان سے جاری و ساری ہے اور ہر سال تیس تا چالیس افراد اور اتنی ہی تعداد میں خواتین اس دینی نصاب سے مستفیض ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے اپنی حیاتِ مستعار کے آخری دور میں دینی نصابِ تعلیم کے ضمن میں ایک نہایت غیر معمولی تجربہ کیا جو بحمد اللہ پچھلے دس سال سے عمدگی کے ساتھ جاری ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ سنہ ۸۸-۱۹۸۷ء میں قرآن کالج کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا جہاں ایف اے' آئی کام اور بی اے کی تعلیم کے ساتھ ایک مختصر دینی نصابِ تعلیم کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ کئی سال کے تجربے کے بعد ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے محسوس کیا کہ یہ مختصر نصاب علومِ دینیہ میں ویسی استعداد نہیں پیدا کر پا رہا جو مطلوب ہے۔

(باقی صفحہ 37 پر)

مِلاكُ التأوِيل (۱۴)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سُورةُ المَائِدَة

(۸۸) آیت ۴۰:

﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۰﴾﴾

''کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے' وہ جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جس کی چاہتا ہے مغفرت کرتا ہے' اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

اور سورۃ الفتح کی آیت ۱۴ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۴﴾﴾

''اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے' وہ جس کی چاہتا ہے مغفرت کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے' اور اللہ تعالیٰ مغفرت کرنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔''

ملاحظہ ہو کہ سورۃ المائدۃ میں عذاب کا ذکر پہلے ہے اور مغفرت کا بعد میں' اور سورۃ الفتح میں اس کا الٹ ہے' اور پھر پہلی آیت کے آخر میں کہا گیا: ﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۰﴾﴾ اور دوسری آیت کے آخر میں کہا گیا: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۴﴾﴾ تو یہ دو سوال ہوئے!

پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ المائدۃ کی آیت سے قبل دو گروہوں کی سزا کا ذکر ہے۔ ایک وہ جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ برپا کرتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں اور دوسرا گروہ جو چوری کرتا ہے۔ پہلے گروہ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ

يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۳۳﴾

''وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے پھرتے ہیں' ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کیا جائے یا صلیب پر لٹکایا جائے یا مخالف جانب سے ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیے جائیں۔ اور یہ (سزا) ان کے لیے دنیا میں باعث ذلت ہے اور آخرت میں ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''

پھر بطور استثناء ارشاد فرمایا:

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۴﴾

''سوائے ان لوگوں کے جو توبہ کرلیں اس سے قبل کہ تم ان پر قابو پالو' تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا' رحم کرنے والا ہے۔''

یہاں ان کی دنیوی سزا کا بھی بیان ہو گیا اور اخروی سزا کا بھی بشرطیکہ وہ ان اعمال کو جائز سمجھتے ہوئے کرتے ہوں' یا ناجائز بھی سمجھتے ہوں لیکن ان کے تائب ہونے سے قبل ان پر قابو پا لیا گیا ہو۔ ہاں اگر وہ قابو پائے جانے سے قبل توبہ کرلیں تو آخرت میں ان کے لیے مغفرت اور رحمت کا وعدہ ہے۔

اسی طرح دوسری قسم کے لوگوں کے بارے میں ارشاد فرمایا:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَاۗءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾

''اور چوری کرنے والا مرد ہو یا عورت' ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو' اللہ کی طرف سے یہ عبرت ناک سزا' بدلہ ہے اس کا جو انہوں نے کیا۔ اور اللہ تعالیٰ قوت والا' حکمت والا ہے۔''

اور پھر یہاں بھی اخروی سزا میں استثناء کا ذکر ہے' فرمایا:

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۹﴾

''پھر جو شخص اپنے گناہ کے بعد توبہ کرلے اور اپنی اصلاح کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ بے شک اللہ مغفرت کرنے والا' رحمت کرنے والا ہے۔''

ان دونوں آیتوں (المائدۃ: ۴۰ اور الفتح: ۱۴) میں رحمت و مغفرت کی امید دلانے سے قبل دنیوی سزا کا ذکر کیا گیا' اور پھر اس کے بعد بتایا گیا کہ زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے' وہ جس کی چاہتا ہے مغفرت کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے' تو پچھلی دونوں آیتوں سے اس کی مناسبت ظاہر ہو گئی کہ جہاں عذاب کا ذکر پہلے ہے کہ جس کا تعلق اللہ کی قدرت اور مشیت سے ہے۔

اب آیئے سورۃ الفتح کی آیت کی طرف' اس سے قبل فرمایا:

وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۳﴾

''اور جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہیں لاتا ہے تو ہم نے کافروں کے لیے دہکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔''

اب دیکھئے کہ ایمان کے ساتھ رحمت اور مغفرت کی امید جڑی ہوئی ہے جیسے کفر کے ساتھ عذاب جڑا ہوا ہے' اور اس آیت میں مغفرت کے سبب یعنی ایمان کا ذکر پہلے ہے اور عذاب کے سبب یعنی کفر کا ذکر بعد میں ہے' اس لیے اگلی آیت میں بھی ﴿وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ کا ذکر پہلے ہے اور ﴿يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ﴾ کا ذکر بعد میں ہے۔ اور اس لحاظ سے دونوں آیتوں میں تقدیم و تاخیر (یعنی مغفرت اور عذاب) کا ہونا بھی واضح ہو گیا۔ واللہ اعلم!

(۸۹) آیت ۴۴:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾﴾

''اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ (وحی) کے مطابق فیصلہ نہ کریں' وہی لوگ کافر ہیں۔''

پھر آیت ۴۵ میں فرمایا:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾﴾

''اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ (وحی) کے مطابق فیصلہ نہ کریں' وہی لوگ ظالم ہیں۔''

اور آیت ۴۷ میں فرمایا:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾﴾

''اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ (وحی) کے مطابق فیصلہ نہ کریں' وہی لوگ فاسق ہیں۔''

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تینوں آیات میں کچھ لوگوں کا ایک ہی وصف بیان ہوا ہے' لیکن ان کے بارے میں حکم مختلف بتایا گیا ہے' یعنی وہ کافر ہیں' ظالم ہیں' فاسق ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اگر یہ لوگ اس وصف سے باز نہ آئے تو انہی احکامات کی بنیاد پر آخرت میں ان سے بدلہ لیا جائے گا' حالانکہ چاہے وعدہ ہو یا وعید' عام طور پر اس کی جزاء میں نیچے سے اوپر یا ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اوپر سے نیچے یا ثقیل سے خفیف کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ یعنی سب سے پہلے سخت ترین چیز بتائی گئی اور وہ ہے کفر' پھر اس سے کم یعنی ظلم اور پھر اس سے کم یعنی فسق۔

ہم جواباً عرض کریں گے کہ قرآن کا اسلوب اونچے درجات سے مزید اوپر جانے کا ہے' مثال کے طور پر سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵ ملاحظہ ہو' فرمایا:

﴿وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾﴾

''اور خوشخبری دے دو ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے کہ ان کے لیے ایسی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں' اور جب کبھی انہیں پھلوں میں سے کوئی پھل بطور رزق دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ یہ رزق تو ہمیں پہلے بھی دیا گیا تھا' (حالانکہ) انہیں جو پھل دیا گیا تھا وہ صرف پہلے والوں سے شکل

میں ملتا جلتا تھا۔ اوران کے لیے وہاں پاک وصاف بیویاں ہوں گی اور وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔‘‘

غور کریں کہ یہاں سب سے پہلے انہیں جنت میں داخل ہونے کی بشارت دی گئی اور اس جنت کا یہ وصف بھی بیان کیا گیا کہ وہاں نہریں بہتی ہوں گی‘ کہ باغات کی زندگی پانی کی مرہونِ منت ہے‘ پھر پھل کا دیا جانا ذکر کیا گیا اور وہ بھی ایسے پھل کا جس کی شکل وشباہت کے وہ عادی تھے‘ کیونکہ اگر سامنے ایسی چیز رکھ دی جائے جو بالکل نئی ہو تو طبیعت اسے کھانے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ خود رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک مرتبہ گوہ (کا گوشت) لایا گیا تو آپؐ نے یہ کہہ کر کھانے سے انکار کر دیا کہ ’’یہ میری قوم کے علاقے میں پایا نہیں جاتا اس لیے اسے میں اپنی طبیعت کے موافق نہیں پاتا۔‘‘

رزق کے ذکر کے بعد پاک وصاف بیویوں کی موجودگی کا ذکر کیا کہ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک نعمت دیے جانے کا ذکر ہے‘ اور آخر میں یہ کہہ کر اتمامِ نعمت کر دیا کہ یہاں ہمیشہ ہمیشہ رہنا نصیب ہوگا۔

دوسری مثال: سورۃ الاحزاب میں ارشاد فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا ۝ یُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ﴾ (آیت ۷۱)

’’اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور (ہمیشہ) سیدھی سچی بات کہو۔ اللہ تمہارے کام سنوار دے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔‘‘

تو یہاں غور فرمائیں کہ پہلے اعمال کو سنوارے جانے کا ذکر کیا اور پھر غفرانِ ذنوب کا‘ جو کہ بدلہ ہے تقویٰ اور سچی بات کہنے کا۔

تیسری مثال: سورۃ الحدید میں ارشاد فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ یُؤْتِكُمْ كِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَیَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ؕ﴾ (آیت ۲۸)

’’اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ‘ وہ تمہیں اپنی رحمت کا دوہرا حصہ دے گا اور تمہارے لیے ایسا نور بنا دے گا جس کی روشنی میں تم چلو پھرو گے اور وہ تمہارے گناہ بھی معاف کر دے گا۔‘‘

چوتھی مثال: سورۃ التوبہ میں فرمایا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ﴾ (آیت ۷۲)

’’اللہ نے مؤمن مَردوں اور عورتوں سے وعدہ کیا ہے ایسی جنتوں کا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی‘ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور ایسے پاک اور صاف محلات کا جو ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں ہوں گے۔ اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہے۔‘‘

پانچویں مثال: سورۃ البیّنہ میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ خَیۡرُ الۡبَرِیَّۃِ ۷ جَزَآؤُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ ؕ﴾ (آیت ۸)

’’بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے وہ تمام مخلوق میں سب سے بہتر ہیں۔ ان کے ربّ کے پاس ان کا بدلہ ہے ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی جنتیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی‘ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔‘‘

ان تمام آیات میں خوب سے خوب تر کے حصول کا رجحان یعنی ترقی کا اسلوب پایا جاتا ہے۔ پہلی دو آیات میں اعلیٰ ترین چیز یعنی غفران کا ذکر ہے اور آخری دو آیات میں اللہ کی رضا کا ذکر ہے‘ اور اس میں کیا شک ہے کہ اللہ کی رضا سب سے بڑی نعمت ہے جس کا واضح انداز میں ایک حدیث میں ذکر کیا گیا ہے۔ (اشارہ ہے صحیح مسلم کی اس حدیث کا جس کے راوی ابوسعید الخدری ؓ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ جنت والوں سے کہے گا..... کیا تم اب راضی ہو؟ تو وہ کہیں گے: ہم کیوں نہ راضی ہوں جبکہ اے رب! آپ نے ہمیں وہ کچھ دیا ہے جو آپ نے اپنی مخلوقات میں سے کسی اور کو نہیں دیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کہیں گے: کیا میں تمہیں اس سے افضل چیز نہ دوں؟ تو وہ کہیں گے: اے رب! اس سے افضل اور کیا ہو سکتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے: میں تم سے اپنی رضامندی کا اظہار کرتا ہوں اور یہ کہ اب میں تم سے کبھی بھی ناراض نہ ہوں گا۔‘‘)

اب ہم اس بات کو دوبارہ تاکیداً عرض کر دیں کہ جہاں جہاں وعدۂ الٰہی کا ذکر ہے‘ یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے اور بالکل ایسے ہی جہاں جہاں وعید کا ذکر ہے تو وہاں بھی یہی قاعدہ روا رکھا گیا ہے۔ سورۃ المائدۃ کی آیات بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہیں‘ یعنی آیاتِ وعدۂ الٰہی میں ایک اونچے درجہ سے اوپر کی طرف اور آیاتِ وعید میں خفیف سے ثقیل کا بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ المائدۃ کی تینوں آیات کا اختتام اسی قاعدے کے مطابق ہے‘ یعنی پہلے کُفر کا تذکرہ ہوا‘ پھر اس سے بڑھ کر ظلم کا اور پھر اس سے بڑھ کر فسق کا۔ اور چونکہ ہمارا یہ دعویٰ دلیل کا محتاج ہے اس لیے ہم اس مبحث کو تفصیل سے بیان کریں گے اور آخر میں ابن عباس ؓ اور صاحب الدرّۃ کی رائے بیان کریں گے جو ہماری اس رائے کے مطابق نہیں ہے۔

پہلے تو ہم اس بات کی وضاحت کر دیں کہ جہاں پہلے ثقیل (یعنی سخت حکم) کا ذکر ہوا ہے اور اس کے بعد خفیف (یعنی ہلکے حکم کا) تو وہ ان آیات میں ہے جہاں کسی چیز کا حکم دیا جا رہا ہو یا کسی چیز سے روکا جا رہا ہو۔ مثال کے طور پر ارشاد باری تعالیٰ ملاحظہ ہو:

﴿وَکَتَبۡنَا عَلَیۡہِمۡ فِیۡہَاۤ اَنَّ النَّفۡسَ بِالنَّفۡسِ ۙ وَالۡعَیۡنَ بِالۡعَیۡنِ .....﴾ (المائدۃ: ۴۵)

’’اور ہم نے یہودیوں کے لیے (تورات) میں لکھ دیا تھا کہ جان کا بدلہ جان ہے اور آنکھ کے بدلے آنکھ.....‘‘

یعنی پہلے سب سے اہم چیز کا ذکر کیا اور وہ ہے انسان کی جان اور اس کے بعد اعضاء کا ذکر کیا۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی آیات میں نہ ہی ارتقاء (ادنیٰ سے اعلیٰ) اور نہ ہی خفیف سے ثقیل کا بیان ملحوظ ہوتا ہے‘ اور جو قاعدہ

ہم نے بیان کیا ہے وہ آیاتِ وعد اور وعید سے متعلق ہے۔

سورۃ المائدۃ کی آیات سے سورۂ آل عمران کی درج ذیل آیات بہت مشابہت رکھتی ہیں۔ ان میں تین گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ایمان کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے لیکن ان کا حکم علیحدہ علیحدہ بیان ہوا اور یہاں بھی حکم کی نوعیت خفیف سے ثقیل کی طرف ہے۔

پہلے گروہ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾

''اللہ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت دے گا جو ایمان لانے اور رسول کے حق ہونے کی گواہی دینے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے حالانکہ کھلی کھلی نشانیاں ان کے پاس آ چکی تھیں۔ اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

﴿اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝﴾

''ان کی تو یہی سزا ہے کہ ان پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی طرف سے لعنت ہوگی، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کے عذاب کو ہلکا کیا جائے گا اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی۔''

یہ تو ان کی سزا کا بیان ہو گیا لیکن اس کے بعد ایک استثناء کا بھی ذکر کیا گیا:

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

''مگر جو لوگ اس کے بعد توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں، تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا، مہربان ہے۔''

یعنی اس گروہ کا حال بعد میں دونوں مذکورہ گروہوں کے مقابلے میں ہلکا ہے، اور یہ بات اس آیت کے شانِ نزول سے بھی معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ انصار میں سے ایک مسلمان مرتد ہو کر مشرکوں سے جا ملا لیکن پھر اس نے ندامت کا اظہار کیا اور اللہ کے رسول ﷺ تک پیغام پہنچایا کہ کیا اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ اور پھر ان آیات کے بموجب اس نے توبہ کی، اپنی اصلاح کی اور اپنی توبہ میں صادق ٹھہرا۔

اس کے بعد دوسرے گروہ کا ذکر کیا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الضَّاۗلُّوْنَ ۝﴾

''بے شک وہ لوگ جو ایمان لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے، پھر کفر میں بڑھتے گئے تو ان کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے گی، اور یہی لوگ گمراہ ہیں۔''

ملاحظہ ہو کہ پہلے گروہ کی توبہ قبول ہونے کی بشارت دی گئی ہے، لیکن دوسرے گروہ کی توبہ نہ قبول کیے جانے کا ذکر کیا جا رہا ہے (یعنی وہ توبہ جو موت کے آثار دیکھ کر کی جائے)۔ پھر تیسرے گروہ کا ذکر کیا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ

افْتَدٰی بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾

''بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور کفر کی حالت ہی میں مر گئے' تو ان میں سے اگر کوئی بطور فدیہ زمین بھر سونا بھی دے تو وہ بھی ان سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کے لیے کوئی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔''

پچھلے گروہ سے ان کا حال اس لیے مختلف ہے کہ ان کے بارے میں یہ نہیں کہا گیا تھا کہ وہ اپنے کفر پر مریں گے' لیکن اس گروہ کے بارے میں صراحت سے کہا کہ وہ کفر پر مرے تو اب ان کے لیے امید کی کوئی کرن باقی نہ رہی۔ گویا ان کی حالت پچھلے گروہ کے مقابلے میں شدید تر ہے۔

اور اس مثال سے بھی واضح ہو گیا کہ وعد اور وعید دونوں میں خفیف سے ثقیل حکم کا بیان ہوتا ہے' ایسے ہی ان آیات میں بھی جہاں احسانات کا تذکرہ ہو' جیسے سورۃ النساء میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ﴾ (آیت ۱۱۳)

''اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت کو اتارا اور وہ کچھ سکھایا جسے تم نہ جانتے تھے۔''

یہاں بھی ارتقاء (اعلیٰ کی طرف جانے) کا بیان ہے۔

اب اس تمہید کے بعد ہم اپنے مدعا کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان تینوں آیات میں کفر' ظلم اور فسق بھی اسی ترتیب کو ظاہر کر رہے ہیں کہ جس کا ہم نے بار بار ذکر کیا ہے' یعنی پہلے ایک خفیف حکم کا بیان ہے' پھر اس کے بعد اس سے ذرا بھاری اور پھر آخر میں بھاری ترین کا۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ ''**الحُکم بغیر ما اَنْزَلَ اللّٰہ**'' یہود کے اعمال کے ضمن میں ذکر کیا جا رہا ہے اور اس میں ان کا زانی کے رجم سے اعراض کرنا بھی شامل ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ کافر' ظالم اور فاسق یہ تینوں صفات اہل کتاب کی ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ حکم عام ہے' یہود اور غیر یہود سب کے لیے ہے۔

اب ایک بات تو واضح رہنی چاہیے کہ ان تینوں الفاظ کا صرف ایک مفہوم نہیں ہے بلکہ ان کے معانی کا تعین قرائن سے کیا جاتا ہے۔

''کفر'' اگر قرائن سے خالی ہو تو اس سے دین کا انکار مراد لیا جاتا ہے' اور بعض دفعہ قرینہ کی بنا پر اس سے مراد نعمت کا انکار بھی ہوتا ہے' جیسے فرعون کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے کہنا:

﴿وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾﴾ (الشعراء)

''پھر تو نے وہ کام کیا جو تو کر گیا اور اس وقت تو ناشکروں میں سے تھا۔''

بہر صورت کفر کا مطلب بالکل واضح ہے اور ناشکری کا اس پر اطلاق کبھی کبھار ہوتا ہے' اور جہاں تک ''ظلم'' کا تعلق ہے تو یہ کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر قرینہ نہ ہو تو کسی ایک معنی میں اسے نص قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ (لقمٰن)

''بے شک شرک ظلم عظیم ہے۔''

یونس علیہ السلام کے بارے میں ان کا یہ قول ارشاد ہوا:

﴿سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (الانبیاء)

''اے اللہ! تو پاک ہے، میں ہی ظالموں میں سے تھا۔''

چونکہ انبیاء معصوم ہیں تو شرک تو کیا، گناہ کبیرہ کا بھی ارتکاب ان سے نہیں ہوتا ہے۔ اہل السنّت کا اس بات میں اختلاف نہیں کہ وحی سے پہلے بھی اور بعد بھی وہ کفر سے پاک ہیں؛ جمہور کا اس بات پر اتفاق ہے کہ گناہ کبیرہ سے پاک ہیں بلکہ ان صغائر سے بھی جنہیں عام طور پر گھٹیا سمجھا جاتا ہے، اور صوفیہ کے ایک بڑے طبقے کے نزدیک وہ سرے سے تمام صغیرہ گناہوں سے بھی پاک ہیں —— جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ ان میں سے ہر قسم پر ظلم کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ اور اس پر سب سے بڑی شہادت اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ (النساء: ٤٠)

''بے شک اللہ تعالیٰ ذرہ برابر ظلم روا نہیں رکھتے ہیں۔''

اب اگر ظلم کے یہ مختلف مدارج ہوسکتے ہیں تو جس ظلم کے ساتھ کفر بھی شامل ہوجائے تو کیا وہ خالی کفر سے بڑھ کر نہ ہوگا؟

دیکھئے! اللہ تعالیٰ سورۃ العنکبوت میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَا اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ﴾

''اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مگر وہ لوگ جو ظالم ہیں۔''

اہلِ تفسیر اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ کفار ہیں جو ظلم میں بڑھے ہوئے ہیں۔ یعنی کفر بھی ہے اور اس پر زیادتی بھی ہے۔ اور اس سے قبل ہم وہ آیت پیش کر چکے ہیں جس میں شرک کو ''ظلم عظیم'' کہا گیا۔ (اضافہ از مترجم: موجودہ دور سے تقابل کرتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ دنیا کے کتنے ممالک ہیں جہاں مسلمان کفار کے زیرنگین ہیں لیکن پرامن زندگی بسر کر رہے ہیں، لیکن برما کے کفار نے ظلم کی حد کر دی ہے کہ جو کسی پر مخفی نہیں ہے۔)

رہا تیسرا لفظ ''فسق''، تو قرآن میں اس کا اطلاق گناہ صغیرہ پر نہیں ہوا ہے، البتہ گناہ کبیرہ کی شناعت کو ظاہر کرنے کے لیے اس پر فسق کا اطلاق کیا گیا ہے۔ سورۃ النور کی اس آیت میں پاک دامن عورتوں پر تہمت باندھنے والوں کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾

''اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر وہ چار گواہ نہ لے کر آئیں تو ان کو اسّی کوڑے مارو اور ان کی گواہی کو کبھی قبول نہ کرو، اور یہی لوگ فاسق ہیں۔''

اللہ کے نبی ﷺ نے اس گناہ کو ان سات بڑے گناہوں میں شمار کیا ہے جو انسان کو ہلاک کر دیتے ہیں۔
لیکن زیادہ تر فسق کا اطلاق کفر پر کیا گیا ہے' جیسے ایمان کے مقابلہ میں فسق کا لفظ لایا گیا:

﴿اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ﴾ (السجدۃ:۱۸)

''کیا جو شخص مؤمن ہو وہ فاسق کی مانند ہو سکتا ہے؟''

اس لیے کہ یہاں دو اطراف کا بیان ہو رہا ہے' کیونکہ ایمان کے مقابل کفر وارد ہوا ہے:

﴿فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ﴾ (التغابن:۲)

''اور تم میں سے کچھ کافر اور کچھ مؤمن ہیں۔''

قرآن میں اکثر یہ لفظ یہود اور منافقین کی نسبت سے آیا ہے' فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾﴾ (البقرۃ)

''اور ہم نے آپ پر کھلی کھلی آیات نازل کی ہیں' اور ان کا سوائے فاسقوں کے اور کوئی انکار نہیں کرتا۔''

یہ آیت ابن صوریا لعنہ اللہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ اور ارشاد فرمایا:

﴿مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾﴾ (آل عمران)

''انہی میں سے کچھ مؤمن ہیں لیکن اکثر فاسق ہیں۔''

اور ارشاد ہوا:

﴿فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾﴾ (المائدۃ)

''اور فاسق قوم پر افسوس نہ کر۔''

اور اسی سورت میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۱﴾﴾ (المائدۃ)

''لیکن ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔''

قومِ لوطؑ کے بارے میں بھی یہ لفظ وارد ہوا۔ فرمایا:

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿۷۴﴾﴾ (الانبیاء)

''یہ تھے ہی بدکار لوگ اور فاسق۔''

سورۃ العنکبوت میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۳۴﴾﴾

''ہم اس بستی کے رہنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں کیونکہ یہ لوگ بدکاری کرتے تھے۔''

فسق کا اطلاق ان لوگوں پر بھی کیا گیا جن کا خاتمہ کفر پر ہونا حتمی قرار دیا جا چکا تھا۔ سورۃ یونس میں ارشاد فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَاتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾

''اس طرح آپ کے رب کی یہ بات کہ یہ ایمان نہ لائیں گے تمام فاسق لوگوں کے حق میں ثابت ہو چکی ہے۔''

ابلیس کا سجدہ سے انکار کرنا بھی فسق شمار کیا گیا۔ فرمایا:

﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ﴾ (الکھف: ۵۰)

''اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا۔ وہ جنوں میں سے تھا' پس اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔''

ملاحظہ ہو کہ کتاب اللہ میں یہ لفظ خاص طور پر سرکش کفار کے لیے استعمال ہوا ہے اور اسی لیے زیادہ تر یہود اور منافقین کو اس لفظ سے یاد کیا گیا' اور ان سے بڑھ کر رذیل اور کون ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی نظر میں رہے کہ کتاب اللہ میں ظلم کا وہ وصف نہیں بیان ہوا جو فسق کا بیان ہوا' اور اسی طرح منافقین اور یہود کو' گو وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے تھے' ظالم کے وصف سے بہت کم یاد کیا گیا ہے۔ ایک اور بات بھی پیش نظر رہے کہ اگرچہ ظلم اور فسق دونوں کا اطلاق سرکش کفار کے لیے ہوا ہے لیکن پھر بھی فسق کے ساتھ کتاب اللہ میں ایسے کافروں کو یاد کیا گیا ہے جو بدترین تھے۔ دیکھئے نوح علیہ السلام جب اپنی قوم سے بالکل مایوس ہو جاتے ہیں اور پھر ان کے منہ سے یہ بددعا نکلتی ہے:

﴿وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَي الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝﴾ (نوح)

''اور نوحؑ نے کہا: اے رب! روئے زمین پر کافروں کا ایک گھر تک نہ چھوڑ! اگر تو انہیں چھوڑ دے گا تو وہ تیرے بندوں کو بہکاتے رہیں گے اور صرف ڈھیٹ فاجر کافروں کو پیدا کرتے رہیں گے۔''

اور سورۃ الذاریات میں اسی قوم کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝﴾

''بے شک وہ فاسق قوم تھے۔''

قومِ لوط بھی فحاشی میں اور ایسے عمل میں بہت آگے بڑھ گئی تھی جو ان سے پہلے کسی قوم نے نہیں کیا تھا اور اسی طرح یہود اور منافقین کی بدعملی اور بدکرداری' نہ صرف انہیں اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار ہونے اور لعنت کا مستحق ہونے کی موجب ہوئی' بلکہ فسق بھی ان کی پہچان قرار دیا گیا۔

حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ جہاں کہیں فسق کا لفظ کسی ایک قسم کے گناہ کے لیے استعمال کیا گیا ہے وہاں اس کا اطلاق اس نوع کی سب سے گھناؤنی صورت پر ہوتا ہے' چاہے وہ کفر ہو یا کوئی اور گناہ۔

اب جو سورۃ المائدۃ میں انہیں کافرون اور ظالمون کہا گیا' لیکن اختتام فاسقون پر کیا گیا تو ان کے جرائم کی تفصیل کے لیے سورۃ البقرۃ کی آیات ۸۷ تا ۹۹ کا مطالعہ مفید رہے گا۔ ابتدا اس آیت سے ہوتی ہے:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ

الْبَيِّنٰتِ﴾ (آیت ۸۷)

''اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے' اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں۔''

اور آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ۝۹۹﴾

''اور ان کا انکار کوئی نہیں کرتا سوائے فاسقوں کے۔''

ان آیات میں ان کی دس سے زیادہ مذموم خصلتیں بیان ہوئی ہیں' جیسے اپنی خواہشات کی پیروی کرنا' تکبّر کرنا' رسولوں کو جھٹلانا' انہیں قتل کرنا' یہ کہنا کہ ان کے دلوں پر غلاف چڑھا ہوا ہے اور اسی طرح باقی وہ تمام باتیں جو ان آیات میں بیان ہوئی ہیں۔

ان آیات میں رسولوں کے بھیجے جانے کا اور پھر ان کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کا بھی ذکر کیا گیا۔ سورۃ المائدۃ کی آیات میں بھی یہی مضمون یوں بیان ہوا:

﴿وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ﴾ (آیت ۴۶)

''اور ہم نے ان کے پیچھے پیچھے عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا۔''

کن کے پیچھے؟ ضمیر لوٹتی ہے ان انبیاء کی طرف جن کا ذکر ایک پچھلی آیت میں کیا گیا:

﴿يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا﴾ (آیت ۴۴)

''اس (تورات) کے مطابق فیصلہ دیتے ہیں وہ نبی جو اسلام لائے۔''

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ جو باتیں اختصار کے ساتھ سورۃ المائدۃ میں بیان ہوئیں' وہی سورۃ البقرۃ میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئیں اور پھر سورۃ البقرۃ کی آیات کے اختتام پر ارشاد ہوا:

﴿وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ۝۹۹﴾

اور سورۃ المائدۃ کی آیات کے اختتام پر بھی ایسے ہی ارشاد ہوا:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝۴۷﴾

اب ان دونوں جگہوں کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ یہاں پر جتنی بھی صفاتِ رذیلہ بیان ہوئی ہیں وہ کفر اور ظلم سے بڑھ کر ہیں' کیونکہ یہ ایسا کفر ہے کہ جو تمام قبیح صفات کا جامع ہے' اور یہی وجہ ہے کہ ابلیس کی نافرمانی کے لیے بھی یہی لفظ (فسق) استعمال کیا گیا جیسے پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کیونکہ قرائن یہی بتاتے ہیں کہ اس کا گناہ نرے کفر اور ظلم سے بڑھ کر تھا۔

یہاں ہم ابن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے تفصیل کے ساتھ ذکر کر دیتے ہیں جس سے ہمارے موقف کی تائید ہوتی ہے۔ زمخشری لکھتے ہیں:

''قولِ ابنِ عباسؓ کے مطابق یہاں یہ بات واضح ہے کہ یہ تینوں اوصاف یہود کے ہیں اور ان میں ترتیب

پائی جاتی ہے۔ ان تینوں الفاظ کے ذکر کیے جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کفر نرا کفر نہ تھا بلکہ اللہ کی آیات کو حقیر جان کر انہوں نے ظلم کا ارتکاب کیا اور اللہ کی نازل کردہ وحی کی مخالفت کر کے اپنی سرکشی کو ظاہر کیا۔'' (حوالہ الکشاف ۱:۴۶۳)

تو گویا وہ آیات کو حقیر جاننے کو ظلم سے اور سرکشی کو فسق سے تعبیر کر رہے ہیں' اور ایسے ہی صاحب کشاف نے سورۃ البقرۃ کی آیت ﴿وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝۹۹﴾ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہاں سرکش کافر مراد ہیں۔ گویا وہ آیات کی تحقیر کو ظلم کا مادہ قرار دے رہے ہیں اور یوں ان کا کفر اس ظلم کے بعد اپنی شدت میں بڑھ جاتا ہے اور پھر ان کی سرکشی مستزاد کہ جس کی بنا پر اب وہ فاسق کہلائے جانے کے مستحق ٹھہرے۔ سرکشی کے لیے عربی میں لفظ ''تَمَرَّدَ'' بولا جاتا ہے جو ''مَرَدَ'' سے تفعُّل کا صیغہ ہے اور باب تفعل میں کسی چیز کا عادت بن جانا اور بار بار کیا جانا شامل ہے۔ اب کیا یہ وہی بات نہیں ہے جو ہم نے بار بار لکھی ہے کہ ان آیات کی ترتیب میں خفیف سے ثقیل کی طرف جانے کا رجحان پایا جاتا ہے۔

یہاں تک ہمارا مدعا تو واضح ہو گیا کہ سورۃ المائدۃ کی آیات میں خفیف سے ثقیل کی طرف جانے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اب ہم ایک اور نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ ان آیات میں خاص طور پر یہود کی طرف اشارہ ہے' اس لیے کہ انہوں نے تورات میں رجم کے ثبوت کے باوجود اس کا انکار کیا۔ جن جن باتوں کا عہد کیا تھا ان سب کی نافرمانی کی اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تورات میں ہی ان سے یہ عہد و پیمان لیے گئے تھے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۴ سے آغاز کلام ہوتا ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ﴾

''اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ تم اپنا خون نہ بہاؤ گے۔''

اور پھر یہ سلسلہ کلام آیت ۸۵ تک چلا جاتا ہے:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ﴾

''کیا تم کتاب کے کچھ حصے پر ایمان لاتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔''

یعنی انہوں نے جو کچھ بھی کیا وہ اللہ کی نازل کردہ وحی کے خلاف کیا اور اسی لیے وہ کافر' ظالم اور فاسق ٹھہرے' اور ان کے انہی کرتوتوں کی بنا پر آیاتِ المائدۃ کا نزول ہوا۔ لیکن واضح رہے کہ اگر کوئی حکم کسی خاص سبب کی بنا پر نازل ہو تو پھر بھی اس کی عمومیت باقی رہتی ہے اور علم اصول کے ماہرین کا اس پر اتفاق ہے۔ اس کی ایک مثال حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی بکری کے واقعہ کی ہے۔ (یعنی بکری ذبح کر دی گئی تھی اور اس کی کھال کو پھینک دیا گیا تھا تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ تم نے اس کی کھال سے دباغت کے بعد کیوں نہ فائدہ اٹھایا؟ گویا یہ حکم صرف حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی بکری کے ساتھ خاص نہ تھا بلکہ اسی طرح ہر بکری کی کھال سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ از: ص ح)

اور یہ حکم عمومی اس وقت ہوتا ہے جب اس حکم کے خاص ہونے کے قرائن نہ ہوں۔ اور جہاں تک سورۃ المائدۃ کے موضوع کا تعلق ہے تو کتاب وسنت میں کئی جگہوں پر ایسے دلائل پائے جاتے ہیں جو اس کے عام ہونے کی تائید کرتے ہیں۔ اور اس بنا پر ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ گو یہ آیات یہود کے کچھ افعال کی بنا پر نازل ہوئیں لیکن یہ حکم ہر اس شخص پر عائد ہوتا ہے جو اللہ کی نازل کردہ وحی کے خلاف فیصلہ دے' اِلا یہ کہ وہ جاہل ہو اور عمداً وہ مخالفت نہ کر رہا ہو' یا اس نے عمداً گناہ کیا ہو لیکن صحیح اعتقاد رکھتا ہو اور زبان سے اس کا اقرار بھی کرتا ہو' کیونکہ شریعت میں ان دونوں اقسام کا استثناء ثابت ہے۔

خوارج نے ان آیات اور ان سے ملتی جلتی آیات کے عموم کو دلیل بنا کر ہر اُس شخص کو کافر قرار دیا ہے جو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا ہو' لیکن ان کے دعویٰ پر کوئی نص نہیں ہے اور کئی دوسرے دلائل سے ان کے دعویٰ کو رد کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ خیال رہے کہ یہاں پر جو عمومی حکم پایا جاتا ہے تو ماننا پڑے گا کہ پھر یہاں حرف ''مَنْ'' بطورِ شرط آیا ہے' اور جمہور کے نزدیک حرف ''مَنْ'' حروفِ شرطیہ میں سے ہے۔

ہم اپنا نقطہ نظر تفصیلی طور پر پیش کر چکے ہیں اور اب آخر میں ابوالفضل بن الخطیب اور صاحب ''دُرّۃ التنزیل وغُرّۃ التأویل'' (ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الخطیب الاسکافی' ف ۴۲۰ھ) کا موقف پیش کرتے ہیں کہ جنہوں نے ان آیات کی ایک مختلف تاویل کی ہے۔

صاحب ''درّۃ التنزیل'' نے ان آیات کے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے کلام کیا ہے' وہ کہتے ہیں کہ پہلی دو آیات میں تو ربط پایا جاتا ہے۔ پہلی آیت میں صرف کفر کا تذکرہ ہے لیکن دوسری آیت میں کفر کے ساتھ ظلم بھی پایا جاتا ہے اور اس لحاظ سے وہ خالی کفر سے ایک قدم آگے ہے' اور اس لحاظ سے وہ وہی بات کہہ رہے ہیں جو ہم کہتے آئے ہیں۔ لیکن وہ تیسری آیت کو پہلی دونوں آیات سے بالکل الگ مانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پہلی دونوں آیات میں ذکر کردہ کفر اور ظلم صرف یہود کے ساتھ خاص ہے' کیونکہ ان آیات سے پہلے انہی کا تذکرہ چلا آیا ہے۔

دیکھئے' پہلی آیات سے قبل تورات کے اتارے جانے کا اور اس کے مطابق فیصلے کیے جانے کا تذکرہ ہے اور پھر کہا: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾۔ ان آیات سے قبل ان کے ان جرائم کا ذکر ہے جو وہ خود اپنی جانوں پر روا رکھتے تھے۔ دوسروں کے بارے میں ان کے ظلم کا تذکرہ نہیں ہے' اس لیے صرف ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ پر اکتفا کیا گیا۔ اگلی آیت میں ان کے اس ظلم کا تذکرہ ہے' جو وہ دوسروں کے حق میں کیا کرتے تھے یعنی قانونِ قصاص کا' تو وہاں ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ کہنا مناسب تھا' کہ یہاں ایک مزید ظلم کا اضافہ ہو گیا تھا' یعنی دوسروں کے ساتھ بھی ظلم کا ارتکاب کرنا۔ گویا اب صرف کفر نہ رہا بلکہ کفر کے ساتھ مزید اضافہ ہو گیا۔

تیسری آیت انجیل کے نازل کیے جانے کے بارے میں ہے' گویا یہاں سے ایک نئی بات شروع ہو رہی

ہے جس کا پہلی دو آیات سے کوئی تعلق نہیں ہے' اور یہ بات ہر ایک کے علم میں ہے کہ اللہ کی نازل کردہ وحی کے مطابق فیصلہ نہ کرنا جیسے ایک کافر سے ہوتا ہے ویسے ایک غیر کافر سے بھی ہوسکتا ہے' اور چونکہ اس کی حیثیت بعض اوقات بالکل کافر جیسی نہیں ہوتی اس لیے وہ فاسق کہلائے گا نہ کہ کافر۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہاں آخر میں کہا گیا ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝﴾۔

اس رائے کے مطابق کفر اور ظلم یہود کے ساتھ خاص ہے۔ پہلی دونوں آیات میں وہی مقصود کلام ہیں البتہ ''فسق'' میں وہ دوسروں کے ساتھ شریک ہیں۔ اس اعتبار سے پہلی دونوں آیات میں ''مَنْ'' موصولہ ہے (الَّذِیْ کے معنوں میں)' لیکن تیسری آیت میں ''مَنْ'' شرطیہ ہے اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلی دو آیات میں ایک مخصوص گروہ کے طرزِ عمل کا بیان ہے اور تیسری آیت میں شرط کا مفہوم ہے' اس لیے اس میں عموم پایا جاتا ہے۔ اور پھر ملاحظہ ہو کہ اس رائے کے حامل کے نزدیک ان آیات میں ارتقاء یا ایک حالت سے دوسری حالت تک منتقل ہونے کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔

کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ صاحبِ دُرّۃ التنزیل نے جس مقصد کے پیش نظر یہ کتاب لکھی ہے' اس اعتبار سے اس کا ذکر کردہ جواب بالکل درست ہے۔ مقصدِ کتاب یہ تھا کہ متشابہ آیات میں فرق کو واضح کیا جائے' مثلاً یہاں یہ بتایا جائے کہ اللہ کی نازل کردہ وحی کے مطابق فیصلہ نہ کرنے پر اگر کفر کا حکم لگایا گیا ہے تو کیا وہ اس حکم سے مختلف ہے جہاں ایسے شخص کو ظالم یا فاسق کہا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہاں تک تو یہ بات درست ہے' لیکن ملاحظہ ہو کہ صاحب کتاب نے پہلی دو آیات میں وہی اسلوب اختیار کیا ہے جسے ہم ارتقا یا ترقی کے نام سے بار بار ذکر کر چکے ہیں۔ اگر وہ تیسری آیت میں بھی اس کا اعتبار کرتے تو موقع محل کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہوتا۔ اب جب انہوں نے اس قاعدے کا لحاظ نہ کیا تو پھر وہ تفصیل کرنے پر مجبور ہوئے کہ پہلی دو آیات میں تو ''مَنْ'' موصولہ ہے' کیونکہ دونوں جگہ یہود کا ذکر ہے اور تیسری آیت میں ''مَنْ'' شرطیہ ہے تاکہ اس سے عموم ثابت ہو جائے۔ لیکن ہماری رائے کے مطابق تیسری آیت بھی پہلی دو آیات کے ساتھ متصل ہے' اور تینوں اوصاف یعنی کفر اور ظلم اور فسق میں خفیف سے ثقیل کی طرف جانے کا واضح اشارہ دیا جا رہا ہے۔ اور جو کچھ صاحب کتاب (دُرّۃ التنزیل) نے بطور تفصیل کہا ہے وہ درست نہیں ہے۔

ہم اپنی اس رائے پر قائم ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہی وہ مناسب ترتیب ہے جو ان آیات میں وارد ہوئی ہے' اور اگر اس کے مخالف ہوتا تو وہ قطعاً غیر مناسب ہوتا۔ واللہ اعلم!

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۃ الانفال

آیات ۱ تا ۴

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝

ن ف ل

نَفَلَ یَنْفُلُ (ن) نَفْلاً : (۱) زیادہ عطیہ دینا۔ (۲) مالِ غنیمت تقسیم کرنا۔

نَفَلٌ، ج: اَنْفَالٌ (اسم ذات) : مالِ غنیمت۔ زیرِ مطالعہ آیت ۱

نَافِلَةٌ : (۱) فرض سے زیادہ، اضافی (۲) اولاد کی اولاد، پوتا۔ ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾ (الاسراء:۷۹) ''اور رات میں سے جاگ کر نماز پڑھیے اس میں، اضافی ہوتے ہوئے آپؐ کے لیے۔'' ﴿وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ﴾ (الانبیاء:۷۲) ''اور ہم نے عطا کیا انؑ کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ پوتا ہوتے ہوئے۔''

و ج ل

وَجِلَ یَوْجَلُ (س) وَجَلاً : دل میں خوف محسوس کرنا، کانپ اٹھنا، ڈرنا۔ زیرِ مطالعہ آیت ۲

وَجِلٌ (صفت ہے جو اسم الفاعل کے معنی میں آتا ہے) : خوف محسوس کرنے والا، ڈرنے والا۔ ﴿اِنَّا

مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ﴿۵۲﴾ (الحجر) ''بے شک ہم تم لوگوں سے خوف محسوس کرنے والے ہیں۔''

ترجمہ:

يَسْئَلُوْنَكَ : یہ لوگ پوچھتے ہیں آپؐ سے	عَنِ الْاَنْفَالِ: اموالِ غنیمت کے بارے میں
قُلِ : آپؐ کہہ دیجیے	الْاَنْفَالُ : اموالِ غنیمت
لِلّٰهِ : اللہ کے لیے ہے	وَالرَّسُوْلِ : اوران رسولؐ کے لیے ہے
فَاتَّقُوا : پس تم لوگ تقویٰ اختیار کرو	اللّٰهَ : اللہ کا
وَاَصْلِحُوْا : اوراصلاح کرو	ذَاتَ بَيْنِكُمْ : تمہارے درمیان والی (رنجش کی)
وَاَطِيْعُوا : اوراطاعت کرو	اللّٰهَ : اللہ کی
وَرَسُوْلَهٗٓ : اوراس کے رسول کی	اِنْ : اگر
كُنْتُمْ : تم لوگ	مُّؤْمِنِيْنَ : ایمان لانے والے ہو
اِنَّمَا : کچھ نہیں سوائے اس کے کہ	الْمُؤْمِنُوْنَ : ایمان لانے والے
الَّذِيْنَ : وہ لوگ ہیں جو کہ	اِذَا : جب کبھی بھی
ذُكِرَ : ذکر کیا جاتا ہے	اللّٰهُ : اللہ کا
وَجِلَتْ : تو کانپ اٹھتے ہیں	قُلُوْبُهُمْ : ان کے دل
وَاِذَا : اور جب کبھی	تُلِيَتْ : پڑھ کر سنائی جاتی ہیں
عَلَيْهِمْ : ان کو	اٰيٰتُهٗ : اس کی آیات
زَادَتْهُمْ : تو وہ زیادہ کرتی ہیں ان کو	اِيْمَانًا : بلحاظ ایمان کے
وَّعَلٰى رَبِّهِمْ : اوراپنے ربّ پر ہی	يَتَوَكَّلُوْنَ : وہ لوگ بھروسہ کرتے ہیں
الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو	يُقِيْمُوْنَ : قائم رکھتے ہیں
الصَّلٰوةَ : نماز کو	وَمِمَّا : اوراس میں سے جو
رَزَقْنٰهُمْ : ہم نے عطا کیا ان کو	يُنْفِقُوْنَ : وہ لوگ خرچ کرتے ہیں
اُولٰٓئِكَ : وہ لوگ	هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ : ہی ایمان لانے والے ہیں
حَقًّا : حقیقتاً	لَهُمْ : ان کے لیے ہی
دَرَجٰتٌ : درجے ہیں	عِنْدَ رَبِّهِمْ : ان کے رب کے پاس
وَمَغْفِرَةٌ : اورمغفرت ہے	وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ : اور باعزت رزق ہے

نوٹ: آیت۲ میں زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا کے الفاظ سے معلوم ہوگیا کہ ایمان ایک ایسے درخت کی مانند ہے جس کی جڑ

بھی ہے اور شاخیں بھی۔ عقائد اس کی جڑ ہیں اور احکامِ شرعی اس کی شاخیں اور برگ و بار ہیں۔ جس طرح ایک شاداب درخت اپنی جڑوں سے بھی غذا حاصل کرتا ہے اور اپنی شاخوں اور پتوں سے بھی' اسی طرح ایمان عقائد کی معرفت اور احکام کی بجا آوری' دونوں سے غذا اور قوت حاصل کرتا ہے۔ اس لیے اس کے صحیح نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ اس کی جڑ اور اس کی شاخوں' دونوں کی دیکھ بھال ہوتی رہے۔ اس طرح یہ بڑھتا اور پھلتا پھولتا ہے اور اس کے مفقود ہو جانے سے وہ گھٹتا' سکڑتا اور مردہ ہو جاتا ہے۔ (تدبّرِ قرآن)

آیات ۵ تا ۱۰

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّاۗىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَىِٕنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

ش و ك

شَاكَ يَشُوْكُ (ن) شَوْكًا : کسی کو کانٹا چبھونا۔

شَوْكٌ (اسم جنس) واحد شَوْكَةٌ، ج: اَشْوَاكٌ : کانٹا' جنگی ہتھیار۔ زیرِ مطالعہ آیت ۷

غ و ث

غَاثَ يَغُوْثُ (ن) غَوْثًا : مدد کرنا۔ ﴿اِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَاۗءٍ كَالْمُهْلِ﴾ (الکہف:۲۹) ''اگر وہ لوگ مدد کے لیے پکاریں گے تو ان کی مدد کی جائے گی ایک پانی سے جیسے پگھلی ہوئی دھات۔''

اِسْتَغَاثَ يَسْتَغِيْثُ (استفعال) اِسْتِغَاثَةً : مدد کے لیے پکارنا۔ زیرِ مطالعہ آیت ۹

ر د ف

رَدِفَ يَرْدَفُ (س) رَدْفًا : کسی کے پیچھے سوار ہونا' کسی کے پیچھے لگنا۔ ﴿عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝﴾ (النمل) ''ہوسکتا ہے کہ تمہارے پیچھے آ لگی ہو اس کی بعض جس کی تم جلدی مچاتے ہو۔''

رَادِفَةٌ : پیچھے لگنے والی۔ ﴿تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝﴾ (النازعات) ''پیچھے آئے گی اس کے پیچھے لگنے والی۔''

اَرْدَفَ يُرْدِفُ (افعال) اِرْدَافًا : (۱) کسی کو کسی کے پیچھے لگانا۔ (۲) کسی کو اپنے پیچھے لگانا' لگاتار آنا۔

مُرْدِفٌ :لگاتار آنے والا۔زیرمطالعہ آیت ۹

ترکیب : (آیت ۷) ''یَعِدُ'' کا مفعول اول ''کُمْ'' ہے اور مفعول ثانی ''اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ'' ہے۔اس لیے ''اِحْدٰی'' حالتِ نصب میں آیا ہے۔''اَنَّھَا لَکُمْ'' تاکید کے لیے ہے' ''اَنْ یُّحِقَّ'' کے ''اَنْ'' پر عطف ہونے کی وجہ سے ''یَقْطَعَ'' حالت نصب میں ہے۔اس لیے اس کا ترجمہ اسی لحاظ سے ہوگا۔

ترجمہ:

کَمَآ : جیسے کہ	اَخْرَجَكَ : آپؐ کو نکالا
رَبُّكَ : آپؐ کے رب نے	مِنْ بَیْتِكَ : آپؐ کے گھر سے
بِالْحَقِّ :حق کے ساتھ	وَاِنَّ :اور بے شک
فَرِیْقًا :ایک فریق	مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ :مؤمنوں میں سے
لَکٰرِھُوْنَ :یقیناً ناپسند کرنے والا تھا	یُجَادِلُوْنَكَ:وہ لوگ بحث کرتے تھے آپؐ سے
فِی الْحَقِّ :حق (بات) میں	بَعْدَ مَا :اس کے بعد کہ جو
تَبَیَّنَ :واضح ہوا	کَاَنَّمَا : گویا کہ
یُسَاقُوْنَ :وہ لوگ ہانکے جاتے ہیں	اِلَی الْمَوْتِ :موت کی طرف
وَ:اس حال میں کہ	ھُمْ :وہ
یَنْظُرُوْنَ : دیکھتے ہیں	وَاِذْ :اور جب
یَعِدُکُمْ:وعدہ کیا تم سے	اللّٰهُ :اللہ نے
اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ :دو جماعتوں کی ایک کا	اَنَّھَا : کہ وہ
لَکُمْ :تمہارے لیے ہے	وَتَوَدُّوْنَ :اور تم لوگ چاہتے تھے
اَنَّ : کہ	غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَةِ :ہتھیار والی کے علاوہ
تَکُوْنُ :ہو	لَکُمْ :تمہارے لیے
وَیُرِیْدُ :اور چاہتا تھا	اللّٰهُ :اللہ
اَنْ : کہ	یُّحِقَّ :وہ حق کرے
الْحَقَّ :حق کو	بِکَلِمٰتِهٖ :اپنے فرمانوں سے
وَیَقْطَعَ :اور وہ کاٹے	دَابِرَ الْکٰفِرِیْنَ : کافروں کی جڑ کو
لِیُحِقَّ : تا کہ وہ حق کرے	الْحَقَّ :حق کو
وَیُبْطِلَ :اور باطل کرے	الْبَاطِلَ :باطل کو
وَلَوْ :اور اگر چہ	کَرِہَ :ناپسند کریں

الْمُجْرِمُوْنَ : مجرم لوگ — اِذْ : جب
تَسْتَغِيْثُوْنَ : تم لوگ مدد کے لیے پکارتے تھے — رَبَّكُمْ : اپنے رب کو
فَاسْتَجَابَ : تو اس نے جواب دیا — لَكُمْ : تمہارے لیے
اَنِّيْ : کہ میں — مُمِدُّ : مدد کرنے والا ہوں
كُمْ : تمہاری — بِاَلْفٍ : ایک ہزار سے
مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ : فرشتوں میں سے — مُرْدِفِيْنَ : لگاتار آنے والے ہوتے ہوئے
وَمَا جَعَلَهُ : اور نہیں بنایا اس کو — اللّٰهُ : اللہ نے
اِلَّا : مگر — بُشْرٰى : خوشخبری
وَلِتَطْمَئِنَّ : اور تاکہ مطمئن ہوں — بِهٖ : اس سے
قُلُوْبُكُمْ : تمہارے دل — وَمَا النَّصْرُ : اور نصرت نہیں ہے
اِلَّا : مگر — مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ : اللہ کے پاس سے
اِنَّ اللّٰهَ : بے شک اللہ — عَزِيْزٌ : بالا دست ہے
حَكِيْمٌ : حکمت والا ہے

نوٹ: یہ آیات ان روایات کی تردید کر رہی ہیں جو جنگ بدر کے سلسلہ میں عموماً کتب سیرت و مغازی میں نقل کی جاتی ہیں، یعنی یہ کہ ابتداءً نبی اکرم ﷺ اور مؤمنین قافلے کو لوٹنے کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے تھے۔ پھر چند منزل آگے جا کر جب معلوم ہوا کہ قریش کا لشکر قافلہ کی حفاظت کے لیے آ رہا ہے، تب یہ مشورہ کیا گیا کہ قافلے پر حملہ کیا جائے یا لشکر کا مقابلہ؟ اس کے برعکس قرآن یہ بتا رہا ہے کہ جس وقت نبی اکرم ﷺ اپنے گھر سے نکلے تھے اسی وقت یہ امر حق آپؐ کے پیش نظر تھا کہ قریش کے لشکر سے فیصلہ کن مقابلہ کیا جائے۔ اور یہ مشاورت بھی اسی وقت ہوئی تھی کہ قافلہ اور لشکر میں سے کس کو حملہ کے لیے منتخب کیا جائے اور باوجود اس کے کہ مؤمنین پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ لشکر ہی سے نمٹنا ضروری ہے، پھر ان میں سے ایک گروہ اس سے بچنے کے لیے حجت کرتا رہا۔ اور بالآخر جب آخری رائے یہ قرار پا گئی کہ لشکر ہی کی طرف چلنا چاہیے تو یہ گروہ مدینہ سے یہ خیال کرتا ہوا چلا کہ ہم سیدھے موت کے منہ میں ہانکے جا رہے ہیں۔ (تفہیم القرآن)

آیات ۱۱ تا ۱۹

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ
عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ﴿۱۱﴾ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ
اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ

الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ
وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ۝ يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ
دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ
وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ
الْكٰفِرِيْنَ ۝ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ
وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـــًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

ع ن ق

عَنِقَ يَعْنَقُ (س) عَنَقًا : لمبی گردن والا ہونا۔

عُنُقٌ، ج: اَعْنَاقٌ : گردن۔ زیر مطالعہ آیت ۱۲

ب ن ن

بَنَّ يَبِنُّ (ض) بَنًّا : کسی جگہ اقامت پذیر ہونا۔

بَنَانٌ (اسم جنس) : واحد بَنَانَةٌ ج بَنَانَاتٌ: انگلیوں کے پور۔ زیر مطالعہ آیت ۱۲

ز ح ف

زَحَفَ يَزْحَفُ (ف) زَحْفًا : آہستہ آہستہ گھسٹنا' کثرت کی وجہ سے لشکر کا آہستہ آہستہ چلنا' زیر مطالعہ آیت ۱۵

ح و ز

حَازَ يَحُوْزُ (ن) حَوْزًا : اکٹھا کرنا' جمع کرنا۔

تَحَوَّزَ يَتَحَوَّزُ (تفعل) تَحَوُّزًا : سانپ کا کنڈلی مارنا' حمایتی سے جاملنا۔

مُتَحَيِّزٌ (اسم الفاعل) : جاملنے والا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۶

ترجمہ:

اِذْ : جب

النُّعَاسَ : اونگھ سے

مِّنْهُ : اپنی طرف سے

عَلَيْكُمْ : تم پر

مَآءً : کچھ پانی

يُغَشِّيْكُمُ : اس نے ڈھانپ دیا تم کو

اَمَنَةً : امن ہوتے ہوئے

وَيُنَزِّلُ : اور اس نے اتارا

مِّنَ السَّمَآءِ : آسمان سے

لِّيُطَهِّرَكُمْ : تاکہ وہ پاک کرے تم کو

بِهٖ :اس سے
عَنْكُمْ :تم سے
وَلِيَرْبِطَ :اور تا کہ وہ مضبوط کرے
وَيُثَبِّتَ :اور وہ جما دے
الْاَقْدَامَ :قدموں کو
يُوْحِيْ :وحی کیا
اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ :فرشتوں کی طرف
مَعَكُمْ :تمہارے ساتھ ہوں
الَّذِيْنَ :ان لوگوں کو جو
سَاُلْقِيْ :میں ڈالوں گا

كَفَرُوْا :کفر کیا
فَاضْرِبُوْا :پس تم لوگ مارو
وَاضْرِبُوْا :اور مارو
كُلَّ بَنَانٍ :سب پوروں کو
بِاَنَّهُمْ :اس سبب سے کہ انہوں نے
اللّٰهَ :اللہ کی
وَمَنْ :اور جو
اللّٰهَ :اللہ کی
فَاِنَّ :تو بے شک
شَدِيْدُ الْعِقَابِ: گرفت کرنے کا سخت ہے
فَذُوْقُوْهُ :پس تم لوگ چکھو اس کو
لِلْكٰفِرِيْنَ :کافروں کے لیے
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ :اے لوگو جو
اِذَا :جب کبھی
الَّذِيْنَ :ان سے جنہوں نے
زَحْفًا :لشکر کے چلتے ہوئے

وَيُذْهِبَ :اور وہ لے جائے
رِجْزَ الشَّيْطٰنِ :شیطان کی نجاست کو
عَلٰى قُلُوْبِكُمْ :تمہارے دلوں کو
بِهٖ :اس سے
اِذْ :جب
رَبُّكَ :آپؐ کے رب نے
اَنِّيْ :کہ میں
فَثَبِّتُوا :پس تم لوگ جما دو
اٰمَنُوْا :ایمان لائے
فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ : ان کے دلوں میں جنہوں نے
الرُّعْبَ :رعب
فَوْقَ الْاَعْنَاقِ :گردنوں کے اوپر
مِنْهُمْ :ان میں سے
ذٰلِكَ :یہ
شَآقُّوا :مخالفت کی
وَرَسُوْلَهٗ :اور اس کے رسول کی
يُّشَاقِقِ :مخالفت کرے گا
وَرَسُوْلَهٗ :اور اس کے رسول کی
اللّٰهَ :اللہ
ذٰلِكُمْ : یہ ہے
وَاَنَّ :اور یہ کہ
عَذَابَ النَّارِ :آگ کا عذاب ہے
اٰمَنُوْٓا :ایمان لائے
لَقِيْتُمْ :تم لوگ ملو
كَفَرُوْا :کفر کیا
فَلَا تُوَلُّوْهُمُ :تو تم مت پھیرو ان سے

الْاَدْبَارَ : پیٹھوں کو | وَمَنْ : اور جو
يُّوَلِّهِمْ : پھیرے گا ان سے | يَوْمَئِذٍ : اس دن
دُبُرَهٗٓ : اپنی پیٹھ کو | اِلَّا : سوائے اس کے کہ
مُتَحَرِّفًا : جھکائی دینے والا ہوتے ہوئے | لِّقِتَالٍ : قتال کے لیے
اَوْ : یا | مُتَحَيِّزًا : ملنے والا ہوتے ہوئے
اِلٰى فِئَةٍ : کسی جماعت کی طرف | فَقَدْ بَآءَ : تو وہ لوٹا
بِغَضَبٍ : ایک غضب کے ساتھ | مِّنَ اللّٰهِ : اللہ (کی طرف) سے
وَمَاْوٰىهُ : اور اس کا ٹھکانہ | جَهَنَّمُ : جہنم ہے
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ : اور کتنی بری ہے لوٹنے کی جگہ | فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ : تو تم لوگوں نے قتل نہیں کیا ان کو
وَلٰكِنَّ : اور لیکن | اللّٰهَ : اللہ نے
قَتَلَهُمْ : قتل کیا ان کو | وَمَا رَمَيْتَ : اور آپؐ نے نہیں پھینکا
اِذْ : جب | رَمَيْتَ : آپؐ نے پھینکا
وَلٰكِنَّ : اور لیکن | اللّٰهَ : اللہ نے
رَمٰى : پھینکا | وَلِيُبْلِيَ : اور تاکہ وہ آزمائے
الْمُؤْمِنِيْنَ : مؤمنوں کو | مِنْهُ : اس سے
بَلَآءً حَسَنًا : جیسا کہ خوبصورت آزمانے کا حق ہے | اِنَّ اللّٰهَ : بے شک اللہ
سَمِيْعٌ : سننے والا ہے | عَلِيْمٌ : جاننے والا ہے
ذٰلِكُمْ : یہ ہے | وَاَنَّ : اور یہ کہ
اللّٰهَ : اللہ | مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ : کافروں کے داؤں کا کمزور کرنے والا ہے
اِنْ : اگر | تَسْتَفْتِحُوْا : تم لوگ فیصلہ مانگتے ہو
فَقَدْ جَآءَكُمُ : تو آچکا ہے تمہارے پاس | الْفَتْحُ : فیصلہ
وَاِنْ : اور اگر | تَنْتَهُوْا : تم لوگ باز آجاؤ
فَهُوَ : تو یہ | خَيْرٌ : بہتر ہے
لَّكُمْ : تمہارے لیے | وَاِنْ : اور اگر

تَعُوْدُوْا : تم لوگ دوبارہ کرو گے — نَعُدْ : تو ہم (بھی) دوبارہ کریں گے

وَلَنْ تُغْنِيَ : اور ہرگز بے نیاز نہیں کرے گی — عَنْكُمْ : تم کو

فِئَتُكُمْ : تمہاری جماعت — شَيْئًا : کچھ بھی

وَّلَوْ : اور اگر — كَثُرَتْ : وہ زیادہ (بھی) ہو

وَاَنَّ : اور یہ کہ — اللّٰهَ : اللہ

مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ : مؤمنوں کے ساتھ ہے

نوٹ ۱: ہمارے کچھ بھائیوں کی رائے ہے کہ احادیث کی سند پر تو بہت تحقیق ہوئی ہے لیکن ان کے متن پر تحقیق نہیں ہوئی' حالانکہ اس کی سخت ضرورت ہے۔ اس ضمن میں وہ لوگ جو حوالے دیتے ہیں' ان میں زیر مطالعہ آیت ۱۱ کا حوالہ شامل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عین اس وقت اونگھ طاری ہو جائے جب زور و شور سے جنگ جاری ہو اور حالت یہ ہو جائے کہ لوگوں کے ہاتھوں سے تلواریں چھوٹ کر گر پڑی ہوں' یہ بات عقل قبول نہیں کرتی' جبکہ ابن کثیر میں یہی مفہوم دیا ہے' اس لیے احادیث کے متن پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ حقیقت واضح کرنے کے لیے پہلے ہم ابن کثیر کی متعلقہ عبارت نقل کر رہے ہیں' اس کے بعد اپنی وضاحت پیش کریں گے:

''اللہ پاک ان احسانات کو یاد دلاتا ہے کہ وقت جنگ تم پر غنودگی طاری کر کے ہم نے تم پر احسان کیا کہ اپنی قلت اور دشمن کی کثرت کا جو تمہیں احساس تھا اور اس احساس کے تحت تم پر ایک خوف سا طاری تھا' اس سے تمہیں مامون کر دیا اور اسی طرح اللہ نے یومِ اُحد میں بھی کیا تھا (یہاں آیت ۳:۱۵۴ کی متعلقہ عبارت اور ترجمہ ہے)۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جنگ اُحد کے روز مجھے بھی غنودگی آ گئی تھی کہ تلوار میرے ہاتھ سے گری جاتی تھی اور میں اٹھاتا جاتا تھا اور میں لوگوں کو بھی دیکھ رہا تھا کہ ڈھال سر پر لگائے ہوئے نیند میں جھول رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بدر کے روز مقداد رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کے پاس سواری نہیں تھی۔ ہم سب نیند کے عالم میں تھے' لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے صبح تک نمازیں پڑھتے رہے اور خدا کے آگے روتے رہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بروز جنگ یہ اونگھ خدا کی طرف سے گویا ایک امن کی شکل میں تھی اور نماز میں یہی اونگھ شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔ قتادہؒ کہتے ہیں اونگھ سر میں ہوتی ہے اور نیند دل میں ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ غنودگی یومِ اُحد میں گھیرے ہوئے تھی اور یہ خبر تو بہت عام اور مشہور ہے اور یہاں آیت شریفہ سیاق قصہ بدر میں ہے اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ بدر میں بھی غنودگی طاری تھی اور یہ شدتِ جنگ میں مؤمنین پر طاری ہو جایا کرتی تھی تاکہ ان کے قلوب اللہ کی مدد سے مطمئن اور مامون رہیں اور یہ مؤمنین پر اللہ کا فضل اور رحمت ہے۔''

اب پہلی بات یہ نوٹ کریں کہ اس پوری عبارت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد منقول نہیں ہے ۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا — وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

دوسری بات یہ نوٹ کریں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کسی قول سے یہ مترشح نہیں ہے کہ یہ اونگھ عین حالتِ کارزار

میں طاری ہوئی تھی‘ نہ اُحد میں اور نہ ہی بدر میں۔ سورۂ آل عمران کی آیت اس ضمن میں بہت واضح ہے کہ اُحد میں شکست ہو جانے کے بعد مسلمان فوج کے ایک گروہ پر ایک اونگھ طاری کی گئی تھی اور طلحہ ؓ اس کی کیفیت بیان کر رہے ہیں۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وہؓ عین حالت جنگ کی کیفیت بیان کر رہے ہیں تو یہ اس کے اپنے ذہن کا تصوراتی ہیولہ ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حضرت علی ؓ کا قول بہت واضح ہے کہ یہ اونگھ رات کے وقت طاری کی گئی تھی۔ جبکہ ابن مسعود ؓ اور قتادہؒ کے اقوال آیت زیر مطالعہ کی تفسیر سے متعلق ہیں‘ جنگ کے ذاتی تجربہ کا بیان نہیں ہے۔ البتہ ابن کثیرؒ کا اپنا قول یہ ہے کہ اونگھ عین حالت جنگ میں طاری کی گئی تھی۔ تو یہ ایک مفسر کا قول ہے جس سے اختلاف ممکن ہے اور اکثر مفسرین نے انؒ کی رائے سے اختلاف کیا بھی ہے۔

مذکورہ تجزیہ سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسناد کی تحقیق کے بعد جب معلوم ہو جائے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے تو پھر اس کے متن پر تحقیق کرنا چہ معنی دارد۔ ایسا سوچنا بھی بڑی جسارت کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی امان میں رکھے‘ البتہ کسی متن سے کوئی جو مفہوم اخذ کرتا ہے‘ اس مفہوم پر تحقیق ہو سکتی ہے اور اس ضرورت کے ہم معترف ہیں۔ فی زمانہ اس ضمن میں ایک مزید ضرورت کا اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ اس طرح کہ پاکستان بننے کے بعد ہمارے معاشرے میں نو دولتیوں کا ایک طبقہ وجود میں آیا تھا‘ آج کل نو تعلیمیوں کا ایک طبقہ وجود میں آ گیا ہے۔ یہ لوگ جس طرح کے مفاہیم اخذ کرتے ہیں اس کا ایک نقشہ آپ مذکورہ بالا تجزیہ میں دیکھ چکے۔ ان کے دو چار اور مفاہیم اگر آپ کے سامنے آ گئے تو آپ کو بھی اس ضرورت کا احساس ہونے لگے گا کہ مفہوم اخذ کرنے والے کے دماغ پر بھی تحقیق ہونی چاہیے کہ وہ ورکنگ آرڈر میں ہے کہ نہیں؟

آخری بات یہ ہے کہ احادیث کے متن پر تحقیق کرنے سے بات ختم نہیں ہوگی بلکہ بات شروع ہوگی۔ ایک صاحب کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں جو قرآن مجید کی چند آیات کے متن پر تحقیق کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ یہ اللہ کا کلام اور قرآن مجید کی آیات نہیں ہو سکتیں‘ بلکہ یہ من گھڑت (موضوع) آیات ہیں جو کسی نے قرآن میں شامل کر دی ہیں۔ اپنی تحقیق کا لب لباب بڑی داد طلب نظروں سے جب وہ میرے سامنے پیش کر چکے تو میں نے اعتراف کیا کہ آپ کی ریسرچ اتنی گہری ہے کہ وہ ''خوض'' کے ''رتبہ'' کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس لیے صرف آپ ہی اس کے اہل ہیں کہ اب آپ اس آیت کے متن پر تحقیق کریں جس میں اللہ نے قرآن کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ جیسے جاہل سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر لیا۔

نوٹ ۲: آیت ۱۹ میں خطاب مؤمنوں سے نہیں بلکہ کافروں سے ہے۔ مشرکین جنگ بدر کے لیے جب مکہ سے چلنے لگے تو غلافِ کعبہ پکڑ کر دعا مانگنے لگے کہ اے خدا دونوں فریقوں میں جو تیرے نزدیک افضل ہے اور جس کا قبلہ بہتر ہے اس کی مدد فرما (ابن کثیرؒ)۔ آیت میں اسی کا حوالہ ہے۔

تقویٰ: اُخروی محاسبے کا خوف

مدرّس : پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ :

((اِشْتَرٰی رَجُلٌ مِنْ رَجُلٍ عَقَارًا فَوَجَدَ الَّذِی اشْتَرَی الْعَقَارَ فِیْ عَقَارِهٖ جَرَّةً فِیْهَا ذَهَبٌ، فَقَالَ لَهُ الَّذِی اشْتَرَی الْعَقَارَ: خُذْ ذَهَبَكَ، اِنَّمَا اشْتَرَیْتُ مِنْكَ الْاَرْضَ وَلَمْ اَشْتَرِ الذَّهَبَ، وَقَالَ الَّذِیْ لَهُ الْاَرْضُ :اِنَّمَا بِعْتُكَ الْاَرْضَ وَمَا فِیْهَا، فَتَحَاكَمَا اِلٰی رَجُلٍ، فَقَالَ الَّذِیْ تَحَاكَمَا اِلَیْهِ : اَلَكُمَا وَلَدٌ؟ قَالَ اَحَدُهُمَا: لِیْ غُلَامٌ، وَقَالَ الْاٰخَرُ :لِیْ جَارِیَةٌ قَالَ :اَنْكِحَا الْغُلَامَ الْجَارِیَةَ وَاَنْفِقَا عَلٰی اَنْفُسِهِمَا مِنْهُ، فَتَصَرَّفَا))[1]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''(دورِ گزشتہ میں) ایک شخص نے دوسرے سے ایک زمین خریدی! اس زمین میں خریدار کو ایک برتن ملا جس میں سونا تھا۔ وہ اسے لے کر زمین بیچنے والے کے پاس گیا اور کہنے لگا: میاں اپنا یہ سونا سنبھالو' میں نے تو صرف زمین خریدی تھی' تم سے سونا نہیں خریدا تھا۔ زمین بیچنے والے نے جواب دیا: بھائی میں نے تم کو زمین اور جو کچھ اس کے اندر تھا' سب بیچ دیا تھا۔ میں یہ سونا نہیں لیتا۔ دونوں اس معاملہ کو ثالث کے پاس لے گئے۔ ثالث نے پوچھا تم دونوں کے ہاں کوئی اولاد بھی ہے؟ ایک نے کہا: ہاں میرے ہاں لڑکا ہے' دوسرے نے کہا: میرے ہاں لڑکی ہے! ثالث نے فیصلہ کر دیا کہ دونوں کی شادی کر دو اور یہ سونا ان دونوں پر خرچ کر دو۔ چنانچہ ان دونوں نے اسے صرف کیا۔''

اس حدیث کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں۔ ان کا اصل نام عمیر' عبداللہ یا عبدالرحمٰن ہے' مگر یہ اپنی کنیت ہی سے مشہور ہیں۔ یہ اپنے پاس بلّی کا ایک بچہ رکھتے تھے۔ ہریرہ بلی کے بچے کو کہتے ہیں۔ ابو ہریرہؓ نے ۳۰ سال کی عمر میں ۷ھ میں اسلام قبول کیا۔ وہ اصحابِ صُفّہ میں شامل رہے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چار سال سے بھی کم وقت گزارا کہ آپؐ کی وفات ہوگئی۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی احادیث کی تعداد ہر دوسرے صحابی سے زیادہ ہے۔ ان سے مروی احادیث میں ۳۲۵ احادیث تو متفق علیہ ہیں۔ اتنی زیادہ احادیث روایت کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ایمان لانے کے بعد آپؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہے' یہاں تک کہ آپؐ کی وفات ہوگئی۔ آپؓ نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی کہ میں جو سنتا ہوں بھول جاتا ہوں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: جب

☆ بخاری و مسلم بحوالہ ریاض الصالحین

میں بات کروں تو تم اپنا جبّہ پھیلا دیا کرو اور جب ختم کروں تو اسے اپنے اوپر لپیٹ لیا کرو۔ چنانچہ ابو ہریرہ ؓ نے ایسا ہی کیا اور پھر وہ رسول اللہ ﷺ سے سنی ہوئی کوئی بات نہیں بھولے۔

حدیث کے بیان کے مطابق ایک شخص نے دوسرے آدمی سے زمین خریدی۔ جب اُس نے زمین کو کھودا تو اس میں سے ایک برتن برآمد ہوا جس میں سونا تھا۔ جس شخص کو وہ سونا ملا اُس نے زمین بیچنے والے سے کہا کہ میں نے جو زمین تم سے خریدی ہے اس میں سے یہ برتن ملا ہے جس میں سونا ہے۔ یہ برتن اور اس میں جو سونا ہے وہ آپ کا ہے یہ لیجئے۔ زمین بیچنے والے نے کہا کہ یہ سونا تمہارا ہی ہے' میں نے آپ کو زمین بیچی تھی اور اس میں جو کچھ بھی تھا وہ تمہارا ہے۔ خریدار نے کہا نہیں میں صرف زمین کا مالک ہوا ہوں اس سونے کا نہیں۔ دونوں میں گفتگو ہوتی رہی' کوئی بھی وہ سونا لینے کو تیار نہ تھا۔ چنانچہ وہ دونوں کسی تیسرے آدمی کے پاس پہنچے اور اُسے صورت حال بتائی۔ ہر ایک نے یہ کہا کہ یہ سونا میرا نہیں دوسرے کا ہے۔ جب تیسرے آدمی نے ساری بات سن لی تو کہا تمہارے ہاں کوئی اولاد ہے؟ ایک نے کہا میرا ایک بیٹا ہے۔ دوسرے نے کہا میری ایک بیٹی ہے۔ اس پر تیسرے آدمی نے کہا کہ ایسا کرو کہ لڑکے کی شادی اس لڑکی سے کر دو اور سونا ان کو دے دو۔

حدیث میں جن دو آدمیوں کا ذکر ہے اُن کا تقویٰ دیکھئے' ہر ایک دوسرے کو بخوشی زمین سے نکلنے والا مال دے رہا تھا مگر کوئی لینے کو تیار نہیں تھا' بلکہ دوسرے کو دینا چاہتا تھا۔ ہر ایک پر خدا کا خوف طاری تھا اور وہ اخروی محاسبے سے ڈر رہا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ میں سونا لے لوں مگر یہ میرا نہ بنتا ہو' اس شبہ کی بنا پر دونوں میں سے کوئی بھی وہ اسے قبول نہیں کر رہا تھا۔ حدیث میں ہے: ''جو بات تمہیں شک میں مبتلا کرے اسے ترک کر دو اور جس میں کوئی شک و شبہ نہ ہو اُسے اختیار کرو۔'' (سنن ترمذی' عن حسن بن علیؓ)

دونوں نے اس مال کی ملکیت کو مشکوک جانا اور لینے سے انکار کیا۔ حدیث میں ہے: ''حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے' لیکن ان دونوں کے مابین کچھ مشتبہات ہیں جن کے بارے میں کچھ شک سا ہو جاتا ہے۔ اکثر لوگ ان کو نہیں جانتے۔ پس جس شخص نے شبہ والی چیز کو چھوڑ دیا اُس نے اپنے دین اور عزت کو بچا لیا۔'' (صحیح بخاری' عن سیدنا نعمان بن بشیرؓ) دونوں نے سونے کی ملکیت کو اپنے لیے مشکوک سمجھا۔

حدیث میں مذکور دونوں افراد اس سونے کو اپنی ملکیت میں لینے کو تیار نہیں تھے۔ ہر ایک کو خوف تھا کہ اگر میں نے اسے لے لیا اور مجھ سے محاسبہ ہو گیا تو کیا بنے گا۔ حالانکہ ایک دوسرے کو بطیب خاطر لینے پر مجبور کر رہا تھا۔ تقویٰ اسی چیز کا نام ہے کہ انسان ہر وقت اور ہر کام میں اللہ کا خوف رکھے اور کوئی نافرمانی کا کام نہ کرے اور ہر اس کام سے بچے جس کے جائز یا ناجائز ہونے میں شبہ ہو۔

سود حرام ہے۔ آج کل بینکوں کا نظام سود پر چل رہا ہے۔ بعض لوگ اس سود کو حرام نہیں سمجھتے' مگر صاف ظاہر ہے یہ معاملہ مشتبہ ہے' لہٰذا اس کو چھوڑ دینے میں ہی عافیت ہے۔ اسی طرح کوئی بھی کام جس میں جائز یا ناجائز ہونے میں مختلف آراء ہوں ان کا چھوڑ دینا ہی مناسب ہے۔

یہ تو حال ہے شبہ والی بات کا۔ لیکن جو شخص نا جائز طور پر کسی دوسرے کا مال چھین لے‘ چوری کر لے یا دھوکے سے لے لے وہ کیسا مسلمان ہے اور اس کے ایمان کا کیا حال ہے؟ قرض کا لین دین تو جائز ہے۔ قرض لینے والا جس سے قرض لیتا ہے وہ ایک مدت تک کے لیے بطیب خاطر قرض دیتا ہے۔ لینے والا بھی اپنی ضرورت کے لیے لیتا ہے۔ مگر مقروض کے لیے لازمی ہے کہ وہ جلد از جلد اپنا قرضہ ادا کرے‘ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ بیشک مجاہد فی سبیل اللہ شہید بھی ہو جائے تو اُس کی بخشش نہ ہوگی جب تک اُس کے ذمہ قرض ہوگا۔ یہی حال دوسرے حقوق العباد کا ہے۔

اس حدیث کے ذریعے رسول اللہ ﷺ اپنی امت کے لوگوں کو واضح کر رہے ہیں کہ ہر حق دار کو حق ادا کرنا نہایت ضروری ہے‘ اگر کسی کا حق اپنے اوپر ہو لیکن مشتبہ ہو تو بھی اس حق کی ادائیگی کا اہتمام کرنا چاہیے‘ تاکہ مرتے وقت اپنا دامن دوسروں کے حقوق سے پاک ہو۔

❁❁❁

بقیہ: حرفِ اوّل

چنانچہ انہوں نے سنہ ۲۰۰۸ء سے اس قرآن کالج (حالیہ ''کلیۃ القرآن'') میں علم دین کا وہ نصاب بعض اضافوں کے ساتھ جاری کیا جو دینی مدارس میں 'درسِ نظامی' کے نام سے جانا جاتا ہے‘ اور جس کی قدرے وضاحت اوراقِ سابقہ میں کی جا چکی ہے۔ چنانچہ اب اس ادارے میں عصری علوم اور علومِ دینیہ کا وہ امتزاج قائم ہے جو اپنی نوعیت میں بالکل منفرد ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے پورے دو برس اس نظامِ تعلیم کی سرپرستی فرمائی اور متعدد بار طلبہ و اساتذہ سے خطاب فرمایا۔ انہیں اس امتزاجی نصابِ تعلیم سے بہت امیدیں تھیں کہ اس طور سے تعلیم یافتہ نسل احیائے دین کے مقاصد کو بہتر انداز سے سمجھ بھی سکے گی اور درست سمت میں پیش قدمی ممکن ہو سکے گی۔

یہ امر مسلّم ہے کہ انسانی کاوشیں بہر حال بہتری کے امکانات اور تعمیری تنقید کی ضرورت سے مستغنی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت ایک مختلف شے ہے جس کے لیے خلوص و اخلاص اوّلین شرط ہے‘ البتہ آگے بڑھنے کے لیے تعمیری اور مثبت سوچ از بس ضروری ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کارِ خیر میں ہونے والی جملہ مساعی کو نتیجہ خیز بنائے اور اپنے خصوصی فضل و کرم سے انہیں شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین!

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
''بیان القرآن'' کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

کتابتِ مصاحف اور علم الرسم (۲)

پروفیسر حافظ احمد یارؒ

(۱۶) علماءِ رسم نے تمام کلماتِ قرآن کی کتابت (املاء) کا بنظر غائر مطالعہ اور مشاہدہ (مصاحف میں) کیا۔ اور خصوصاً ان کلمات کا تجزیہ کیا جن میں اختلافِ کتابت کی کوئی صورت پائی جاتی ہے۔ پھر ان املائی اختلافات سے کچھ قواعد کلیہ مستنبط کیے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ جملہ اختلافات یا احکامِ رسم کو مندرجہ ذیل چھ قواعد کے تحت منحصر کیا جاسکتا ہے: حذف، زیادۃ، ہمز (رسم ہمزہ)، بدل و وصل و فصل اور ''قراءت کا تنوع''۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ رسم قیاسی کے علماء نے بھی اپنے اصول ان میں سے پہلے پانچ قواعد پر ہی استوار کیے ہیں (۵۰)۔ (صرف چھٹا قاعدہ علم الرسم سے مختص ہے۔) اور بیشتر صورتوں میں ان قواعد کے تحت کلمات کا طریق املاء رسم قیاسی اور رسم قرآنی میں یکساں رہتا ہے۔ (یہ بات پہلے بھی لکھی جا چکی ہے کہ رسم قرآنی نوے فیصد رسم قیاسی کے مطابق ہوتا ہے۔) البتہ رسم قیاسی اور رسم قرآنی میں ان قواعد کے اطلاق میں فرق ہے جس سے اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ علم الرسم کے ان ''قواعدِ ستّہ'' کا مختصر بیان یا ان کا تعارف کچھ یوں ہے:

(۱) حذف: کے تحت ان کلمات سے بحث کی جاتی ہے جن کی کتابت میں کوئی حرف محذوف مگر نطق میں موجود ہوتا ہے یعنی وہ حرف لکھا نہیں جاتا مگر پڑھا ضرور جاتا ہے۔ یہ محذوف حرف عموماً ''ا''، ''و'' یا ''ی'' ہوتے ہیں' اگرچہ ایک آدھ مثال ''ن'' یا ''ل'' کے حذف کی ملتی ہے۔ اس کی مثال ''الرحمٰن''، ''داود'' اور ''النبین'' کے کلمات ہیں جو دراصل الرحمان' داوود' اور النبیین پڑھے جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس قسم کے کلمات کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے اور کتب رسم میں ان سب کا فرداً فرداً ذکر موجود ہے۔

(۲) زیادۃ: سے مراد یہ ہے کہ بعض دفعہ کسی کلمہ میں کوئی حرف لکھا تو جاتا ہے مگر پڑھا نہیں جاتا۔ یہ زائد حرف بھی ہمیشہ ''ا''، ''و'' یا ''ی'' ہی ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال مِائَۃ' اُولٰئك اور ''بِاَیْید'' ہیں جو علی الترتیب مِئَۃ' اُلائك اور بِاَیْدٍ پڑھے جاتے ہیں۔ [آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ اُولٰئِكَ میں حذف اور زیادۃ دونوں قاعدے کارفرما ہیں۔]

(۳) الہمز یا رسم ہمزہ: یعنی ہمزہ کی کتابت اور رسم کی مختلف صورتوں کا بیان۔ ان میں سے بعض صورتیں رسمِ قیاسی سے موافق ملتی ہیں اور بعض مختلف ہوتی ہیں۔ دونوں صورتوں میں کتابت ہمزہ کے قواعد خاصے طویل ہیں۔

☆ اس مضمون کی پہلی قسط جنوری تا مارچ ۲۰۱۸ء کے شمارہ میں شائع ہوئی۔

(۴) بدل: کے تحت ان کلمات کو بیان کیا جاتا ہے جن کی املاء میں ایک حرف کی بجائے کوئی دوسرا حرف لکھا جاتا ہے' حالانکہ تلفظ کا تعین وہی پہلا حرف کرتا ہے' مثلاً الف کی بجائے ''و'' یا ''ی'' لکھنا۔ اس کی مثال الصلٰوۃ' بلٰی اور حتٰی یا متٰی میں ملتی ہے' جو علی الترتیب الصلاۃ' بلا اور ''حتا'' یا ''متا'' پڑھے جاتے ہیں۔ [یہاں بھی آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ بلی' حتی اور متٰی کا قیاسی اور قرآنی رسم یکساں ہے' البتہ لفظ صلٰوہ کا معاملہ مختلف ہے۔ اس کی مثالیں تو اردو میں بھی متعارف ہیں' مثلاً ادنیٰ' اعلیٰ' موسیٰ' عیسیٰ وغیرہ۔]

(۵) وصل وفصل: جسے قطع اور وصل بھی کہتے ہیں۔ اس قاعدہ کے تحت یہ بیان ہوتا ہے کہ دو کلمات (حرف اور اسم یا اسم اور اسم) کو ملا کر یا الگ الگ لکھنے کا قاعدہ کیا ہے' مثلاً فِی مَا اور فیما' اَیْن ما اور اَیْنما، اَمْ مَنْ اور اَمَّنْ' یَوْمَ هُم اور یَومَهُم وغیرہ۔

(۶) قراءت کا تنوّع: یا اختلافِ قراءتین۔ اس میں ان مخصوص کلمات کی املاء کا قاعدہ بیان ہوتا ہے جن میں دو بالکل مختلف مگر بتواتر ثابت قراءتین ہوتی ہیں۔ اس میں محتمل القراءات رسم کے علاوہ [جس کی مثالیں قرآن کریم میں بکثرت ملتی ہیں' ایک مثال لفظ ''ملك'' ہے جو مالك بھی پڑھا جاتا ہے اور مَلِك بھی] وہ کلمات بھی آتے ہیں جو مصاحفِ عثمانیہ میں سے کسی ایک میں ایک قراءت کے مطابق اور کسی دوسرے میں دوسری قراءت کے مطابق لکھے گئے تھے۔ اس کی ایک مثال سورۃ الکہف کی آیت ۳۲ میں وارد کلمہ مِنْهَا کا بعض مصاحف میں مِنْهُمَا (بصیغۂ تثنیہ) لکھنا ثابت ہے۔ اور ورش کی قراءت میں اب بھی اسی طرح بصیغۂ تثنیہ لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔

(۱۷) علم الرسم کے مؤلفین میں مواد کو مرتب شکل میں پیش کرنے کے لیے عموماً دو رجحانات پائے جاتے ہیں:

(۱) بعض علماء اپنی کتاب کو مذکورہ بالا ''قواعدِ ستّہ'' کی ترتیب کے مطابق ابواب وفصول میں تقسیم کر لیتے ہیں اور پھر ان قواعدِ ستّہ میں سے ہر ایک کی کچھ ضمنی تقسیمات بھی کر لیتے ہیں' اور ہر ایک قاعدے کے تحت آنے والے کلمات کے بیان میں قرآن کریم کی ترتیب سور کو ملحوظ رکھا جاتا ہے' مثلاً: سب سے پہلے حذف کے تحت سورت بسورت الحمد سے والناس تک ان کلمات کو بیان کرتے جائیں گے جن کا تعلق اس قاعدہ (حذف) سے ہے۔ اور اس میں بھی پہلے محذوف الالف الفاظ' پھر محذوف الواؤ' پھر محذوف الیاء اور آخر پر محذوف النون اور محذوف اللام کلمات کا ذکر ہوگا' وھٰکذا۔ المهدوی' الجهنی' الدانی' الشاطبی' الجعبری اور الخراز کی تالیفات میں یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔[۵۱]

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پورے قرآن کو الفاتحہ سے والناس تک ایک ایک سورت کو لیتے ہیں اور ہر سورت میں بہ ترتیب آیات ان کلمات کا ذکر کرتے ہیں جن کی املاء میں قواعدِ ستّہ میں سے کوئی ایک یا ایک سے زائد قاعدے استعمال ہوئے ہوں۔ اس طریقے میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی کلمہ پہلی دفعہ سامنے آتا ہے تو نہ صرف اس کا قاعدہ بیان کرتے ہیں بلکہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ لفظ قرآن میں جہاں جہاں بھی آیا ہے اسی قاعدے کے تحت لکھا جاتا ہے یا اس کے کوئی استثناءات بھی ہیں۔

مثلاً سورۃ البقرہ میں ''ذٰلك'' کے متعلق بتائیں گے کہ یہ لفظ قرآن کریم میں جہاں بھی آیا ہے (کیف وقع) بحذفِ الف ہی لکھا جاتا ہے۔[رسم قیاسی والا بھی یہی کہے گا کہ ذلك ہر جگہ اور ہر موقع پر بحذف الف ہی لکھا جاتا ہے۔] پھر ''الکتٰب'' کے متعلق بتائیں گے کہ یہ لفظ پورے قرآن میں بحذفِ الف لکھا جاتا ہے' سوائے چار مواقع کے جن کا ذکر اپنے اپنے موقع پر آئے گا۔اسی طرح ''اُولٰئك'' میں حذف (الف) بھی ہے اور زیادۃ (واو) بھی ہے اور جہاں بھی آتا ہے اسی طرح لکھا جاتا ہے' وغیرہ وغیرہ(۵۲)۔اب آگے جہاں جہاں کلمات ''ذٰلِك'' اور ''اُولٰئِك'' آئیں سگے ان کے متعلق کچھ بیان نہیں کیا جائے گا یا زیادہ سے زیادہ یہ لکھ دیا جائے گا کہ پہلے گزر چکا ہے۔البتہ اگر کلمہ ''الکتب'' کا کوئی اثباتِ الف والا موقع آیا تو کہیں گے کہ یہاں اسے ''کتاب'' لکھنا ہے۔اس طریقے میں چونکہ مؤلف پہلی دفعہ سامنے آنے والے کلمہ کے متعلق بات کر دیتا ہے اس لیے اس لفظ کے مکرر آنے پر قاعدہ مکرر بیان کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی کتاب کا ابتدائی حصہ قواعد کے بیان سے بھرا ہوتا ہے اور آخری حصہ مختصر رہ جاتا ہے۔

اس طریقے پر لکھی گئی کتابوں میں ابوداؤد کی التنزیل' ابوطاہر العقیلی کی **فی مرسوم المصاحف**' ابن وثیق کا رسالہ **فی رسم المصحف الامام** اور ایک مجہول مؤلف کی کتاب **جامع الکلام فی رسم المصحف الامام** قابل ذکر ہیں۔اور اس طریقے پر لکھی ہوئی سب سے جامع اور مبسوط کتاب ارکاٹی کی **نثر المرجان فی رسم نظم القرآن** ہے۔(۵۳)

(۱۸) علم الرسم پر تالیفات کے اس طویل سلسلے اور اس فن کے بارے میں اس سارے اہتمام کی غرض وغایت یہ ہے کہ کاتبِ مصحف کو رسم قرآنی کے احکام سے آگاہی حاصل ہو' تاکہ کلام اللہ کی کتابت میں رسمِ قرآنی کی انفرادیت کو برقرار رکھا جا سکے اور اسے عام رسم املائی یا رسم قیاسی کے ساتھ خلط ملط نہ کر دے۔جب رسمِ قرآنی اور رسم املائی کے اختلاف کی بات ہوتی ہے تو اکثر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ شاید عہد نبوی یا راشدین میں دو طریقِ املاء موجود تھے' یا یہ کہ رسم قیاسی موجود تھا مگر کُتّابِ مصاحف نے (کسی وجہ سے) اس کی خلاف ورزی کی۔یہ نظریہ سراسر غلط ہے۔حقیقت یہ ہے کہ عہد نبوی وراشدین میں املاء عربی کی وہی صورت موجود تھی جس میں مصاحف لکھے گئے۔رسم املائی اور اس کے قواعد تو دوسری صدی ہجری میں وجود میں آئے۔تاہم جب عام پڑھے لکھے لوگ ان قواعد سے شناسا ہوئے اور ان کو ہر دو رسم (قرآنی اور املائی) میں فرق اور اختلاف نظر آیا تو اس کی وجوہ پر غور کیا جانے لگا۔اور اس تحقیق وتفتیش میں رسم قیاسی کو اصل اور رسم قرآنی کو اس سے متفرع سمجھ کر گاڑی کو گھوڑے کے آگے لگا دیا گیا۔(۵۴)

بہرحال ہر دو رسم کے درمیان فی الواقع موجود اختلاف (چاہے جس وجہ سے ہو!) کی بناء پر یہاں دو سوال اہلِ علم کے ذہن میں اُبھرے۔اور یہ سوال آج بھی موجود ہیں: (۱) ایک تو یہ کہ رسم املائی اور رسم قرآنی میں یہ اختلافات کیوں ہیں؟ اور خود رسم قرآنی میں بعض کلمات کی املاء میں اتفاق کی بجائے یہ اضطراب کیوں

موجود ہے کہ ایک لفظ کہیں ایک طریقے سے اور کہیں دوسرے طریقے سے لکھا جاتا ہے؟ (۲) دوسرے یہ کہ کیا ان اختلافات کو برقرار رکھنا ضروری ہے؟ (جواب نفی میں ہو یا اثبات میں مگر) کیوں؟ کس وجہ سے؟

پہلے سوال کے جواب میں اس وقت تک تین نظریات پیش کیے گئے ہیں:

پہلا نظریہ: یہ ہے کہ رسم المصحف توقیفی ہے اور یہ اَسرارِ الٰہی میں سے ایک سر ہے۔ قرآن مجید لوحِ محفوظ میں اسی ''رسم'' کے ساتھ لکھا گیا تھا' اور آنحضرت ﷺ کاتبِ وحی کو ہر لفظ کی مخصوص املاء بھی بتا دیتے اور اسی کے ساتھ لکھنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ ہماری عقل اس کی وجہ کو نہیں پا سکتی' ہمارا کام فقط اس کا اتباع کرنا ہے' وغیرہ (۵۵)۔ پھر بعض لوگوں نے رسم قرآنی کے ان ''اَسرار و حکم'' تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی اور رسم قرآنی کی ایسی عجیب و غریب تعلیلات اور توجیہات پیش کیں جو سراسر غیر معقول اور ناقابل قبول ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال ابو العباس مراکشی کی کتاب ہے۔ بعض نے نحوی بنیادوں پر بھی بعض تعلیلات پیش کی ہیں جن میں نسبتاً معقولیت کا پہلو پایا جاتا ہے۔ (۵۶)

یہ نظریہ (توقیف) معقولیت سے بعید ہے' اس لیے کہ ایک تو آنحضرت ﷺ کی اُمیۃ (لکھنا پڑھنا نہ سیکھنا) قرآن سے ثابت ہے۔ دوسرے روایتاً بھی کاتبانِ وحی کو طریق املاءِ کلمات کے بارے میں قطعاً کوئی ہدایات ثابت نہیں ہیں۔ جب رسم قرآنی کے اتباع کے وجوب والتزام کے بارے میں بعض دوسرے معقول اور وزنی دلائل موجود ہیں تو اس بے سند اور غیر معقول استدلال کا سہارا لینے کی کیا ضرورت ہے؟ خیال رہے التزام رسم عثمانی الگ بات ہے اور نظریہ توقیف الگ۔ دونوں کو ایک سمجھنا خلط مبحث ہے۔ (۵۷)

دوسرا نظریہ: رسم قرآنی کی اصل کے بارے میں دوسرا نظریہ یہ ہے کہ یہ رسم اصطلاحی ہے' یعنی مصاحف عثمانیہ کے کاتبوں نے بعض حکمتوں اور مصلحتوں کی بناء پر اس قسم کا رسم الخط یا طریق املاء اختیار کیا۔ مثلاً ایک حکمت **احتمال القراء ات المتواترہ یا قراء ت عرضۃ اخیرہ یا اشتمال الاحرف السبعہ** کا اہتمام تھا۔ یہ علم القراءات کے ماہرین کی توجیہہ ہے۔ اس بات کی کوئی واضح نقلی دلیل موجود نہیں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا مصاحف عثمانیہ کے کاتبوں نے اس موقع پر بعض کلمات کے لیے کوئی خاص نیا طریق املاء ''ایجاد'' کیا تھا۔ جہاں باہمی اختلاف کی صورت میں کُتّابِ مصاحف کا معاملہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کرنے کا حکم بیان ہوا ہے تو اس میں ایک لفظ ''تابوت'' کی املاء کا معاملہ اوپر جانے کی روایت تو ملتی ہے' لیکن ایسی کوئی روایت نہیں ملتی کہ مثلاً کاتب نے کہاں ایک لفظ بحذف الف لکھنا ہے اور کہاں باثبات الف۔ یا (مثلاً) واو جمع کے بعد کہاں الف زائد لکھنا ہے اور کہاں نہیں لکھنا ہے وغیرہ۔ املاء کلمات کے لیے کوئی طریقہ (اصطلاح) وضع کرنے کا نظریہ اس لیے بھی معقول نہیں لگتا کہ صحابہؓ کا آنحضور ﷺ کے وقت میں بلکہ ان کے سامنے لکھے جانے والے طریق املاء کو ترک کر کے اس کی بجائے کوئی نیا طریق املاء اختیار کرنا بہت مستبعد معلوم ہوتا ہے۔

البتہ علامہ ابن خلدون نے اس کی یہ توجیہہ پیش کی ہے کہ عہدِ نبوی بلکہ راشدین تک عربی کے علم الاملاء کا ارتقاء ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ کتابت کو حجاز میں متعارف ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور املاء کے قواعد و ضوابط

ابھی کمال پختگی کو نہیں پہنچے تھے بلکہ ایک قسم کے عبوری دَور سے گزر رہے تھے اور یہی چیز صحابہؓ کے کلمات کے لکھنے میں املاء کے اختلاف اور اضطراب کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ یہ ایک طرح سے اس میدان میں صحابہؓ کی ''علمی کمزوری'' کا ایک مظہر ہے۔ ابن خلدون نے ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اس سے صحابہ کی (خدانخواستہ) توہین کا کوئی پہلو نہیں نکلتا' اس لیے کہ کتابت اور املاء کی مہارت کی حیثیت ذاتی کمال کی نہیں بلکہ ایک اضافی کمال کی ہے(۵۸)۔ تاہم اس کے اس جرأت مندانہ اور محققانہ نظریہ پر بھی تین قسم کے ردّعمل سامنے آئے ہیں:

(ا) رسم میں نظریۂ توقیف کے حامیوں نے تو خود ابن خلدون کو گستاخ اور جاہل بناڈالا اور بعض نے تو ابن خلدون کے موقف کے پہلے حصے کو بیان کیا مگر (عمداً) دوسرے حصے کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔(۵۹)

(ب) رسم المصحف کے مخالفوں اور ''ہجاء حدیث'' اور ''رسم جدید'' کے حامیوں نے ابن خلدون کی رائے کو اپنے لیے ایک عمدہ ہتھیار خیال کیا' اسے رسم المصحف کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا زریں موقع سمجھا اور اسے اپنی زبان درازی اور صحابہ کے علم میں طعن کے لیے گویا بطور استدلال یا تائید استعمال کیا۔ اس کی ایک مثال ایک مصری مؤلف محمد عبداللطیف کی کتاب ''الفرقان'' میں ''هجاء القرآن ورسمه'' کے عنوان کے تحت نظر آئے گی' جس میں رسم المصحف کے خلاف اپنا سارا زہر اگلنے کے بعد آخر پر ابن خلدون کا اقتباس اس موقف کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے کہ ''رسم المصحف کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہے۔'' یہ کتاب حکومتِ مصر نے ضبط کر لی تھی۔(۶۰)

(ج) بعض اعتدال پسند منصف مزاج اہلِ علم نے ابن خلدون کے نظریہ کو سراہا ہے اور اسے رسم قرآنی اور رسم قیاسی کے باہمی اختلافات کی ایک معقول توجیہہ قرار دیا ہے(۶۱) اور یہ کہ ابن خلدون ہرگز صحابہؓ کی شان میں کسی گستاخی کا مرتکب نہیں ہوا۔ نہ اس نے کبھی یہ کہا کہ رسم المصحف کو ترک کرنا چاہیے اور نہ ہی اس نے مصری تجدد پسند عبدالعزیز فہمی(۶۲) یا مؤلف ''الفرقان'' کی طرح صحابہؓ یا رسم المصحف کے بارے میں جہل یا سخافت وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں' بلکہ اس نے تو رسم المصحف کی تقدیس اور تکریم کی معقول وجہ بھی بیان کر دی ہے۔ البتہ اس نے قائلین توقیف کی غیر معقول تعلیلات پر تنقید ضرور کی ہے۔

تیسرا نظریہ: رسم قرآنی اور عام رسم املائی میں اختلافات کی توجیہہ کا ایک (تیسرا) نظریہ ہمارے زمانے میں سامنے آیا ہے۔ عربی خط (کتابت اور املاء) کی تاریخ اور اس کے ارتقاء پر اثری اکتشافات کے نتیجے میں دستیاب ہونے والے بعض نقوش والواح اور کتابات (Inscriptions) کے حوالے سے جو جدید تحقیق ہوئی ہے(۶۳) اس سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ زمانہ قبل از اسلام اور بعد از اسلام (عہدِ نبوی وراشدین تک) حجاز میں جو قواعدِ کتابت اور طریق املاء رائج تھا اس کی اصل نبطی خط تھا(۶۴) جو شمالی علاقوں (شام وغیرہ) سے حجاز میں آیا تھا۔ اور یہ کہ اس زمانے کی عربی املاء (جو مصاحف عثمانیہ کی تیاری تک رائج تھی) کے کم از کم چار مظاہر تو صاف نبطی الاصل ہیں: (۱) نقط وشکل سے عاری ہونا (۲) وسط کلمہ میں الف کا محذوف ہونا (مالك: ملك)

(۳) تائے تانیث (ۃ) کو تائے مبسوطہ (ت) کی شکل میں لکھنا۔ اور (۴) رسم ہمزہ کے بعض طریقے مثلاً ہمزہ مضمومہ کے بعد ''و'' لکھنا (جیسے اُولئك میں)۔ اور یہ چاروں مظاہر رسم قرآنی میں موجود ہیں۔ (۶۵)

املاء عربی کے ارتقاء کے اس عبوری نظریہ سے ایک ہی مصحف کے اندر کسی لفظ کی کتابت کے اختلاف کی بھی توجیہہ ہو جاتی ہے۔ نبطی خط میں حجاز کے اندر آنے کے وقت تک (کم از کم بھی دو صدیوں کے ارتقاء کی بدولت) املاء کے قواعد میں اگرچہ ایک حد تک پختگی تو آ چکی تھی تاہم ابھی ان میں اتنا استحکام اور اتنی یکسانیت پیدا نہیں ہوئی تھی اور بعض کلمات کو کبھی ایک ہجاء کے ساتھ اور کبھی دوسرے ہجاء کے ساتھ لکھ لیا جاتا تھا (۶۶)۔ یہ تو اسلام کی برکت سے اور کتابتِ مصاحف اور اسلامی علوم کی بدولت ایسا ہوا کہ عربی املاء نے یکسانیت اور استحکام کے سارے مدارج جلدی سے طے کر لیے اور جس کی وجہ سے ''رسم قیاسی'' ایک مستقل علم بن گیا جس پر مستقل تالیفات وجود میں آ گئیں۔ (۶۷)

اور اسی (تیسرے) نظریہ سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خصوصاً کُتّابِ مصاحف اپنے زمانے میں رائج طریقہ ہائے املاء و کتابت سے پوری طرح باخبر تھے۔ یہ تو ممکن ہے کہ ابھی یہ علم خود طفولیت میں ہو مگر صحابہؓ کا اس کے بارے میں علم ہرگز طفل مکتب کا سا نہیں تھا۔ ویسے یہ علم بھی اس وقت تک اپنی طفولیت سے نکل کر بلوغ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ صحابہؓ کے طریق املاء میں کلمات کی صرفی ونحوی ''استعداد'' یا ''بنیاد'' سے آگاہی کا پتہ چلتا ہے (خصوصاً قاعدہ بدل کے اطلاق میں) (۶۸)۔ بعد میں آنے والے رسم قیاسی کی اصل بنیاد یہی ظہورِ اسلام کے وقت رائج طریق املاء و ہجاء ہی تھا۔ بہت کم اصول و قواعد تبدیل کرنے پڑے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اس وقت کا معیاری طریق ہجا وہی تھا جو بعد میں رسم قرآنی کہلایا اور رسم قیاسی اسی میں سے نکلا۔ اور یہی وجہ ہے کہ بیشتر قواعد میں رسم قرآنی رسم قیاسی کے مطابق ہے۔ تمام ''مخالفات'' محدود اور محصور ہیں۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ شاید رسم قیاسی کو مسخ کر کے رسم قرآنی تیار کیا گیا۔ رسم قیاسی تو اس وقت تک موجود ہی نہ تھا اور حقیقت یہی ہے کہ قرآن کریم اپنے زمانے کے معروف طریق املاء کے مطابق ہی لکھا گیا تھا۔

اس تیسرے نظریہ کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ دَورِ صحابہؓ میں ایک بھی ایسا واقعہ بیان نہیں ہوا کہ رسم قرآنی، قرآن کی تلاوت یا قراءت میں کسی صعوبت یا الجھن کا باعث بنا ہو۔ یہ بات سب سے پہلے امام مالک (ت ۱۷۹ھ) کے زمانے میں سامنے آئی جب رسم قیاسی کے اصول و قواعد مرتب ہو چکے تھے اور روزمرہ کی زندگی میں یہی ''نیا'' رسم قیاسی استعمال ہونے لگا تھا اور لوگ اس سے مانوس ہو چکے تھے اور ''پرانا'' طریق املاء اب صرف کتابتِ مصاحف تک محدود ہو گیا تھا، اس لیے وہ عجیب اور غیر مانوس لگنے لگا تھا۔ رسم قرآنی کے معاملے میں آج کل عرب ملکوں کے تعلیم یافتہ لوگوں کو بالکل اسی قسم کی صورتِ حال درپیش ہے۔

(۱۹) رسم المصحف اور رسم قیاسی کے درمیان اختلاف کی توجیہہ کے بارے میں مذکورہ بالا (تین) مواقف سے ہی اس (دوسرے) سوال کے بھی مختلف جواب سامنے آتے ہیں کہ کیا رسم قرآنی اور رسم قیاسی کے

اس فرق واختلاف کو برقرار رکھنا ضروری ہے؟ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ کیا کتابتِ مصاحف میں علم الرسم کے اصولوں (جو رسم مصاحفِ عثمانیہ پر مبنی ہیں) کی پابندی واجب ہے؟ اور ان کی خلاف ورزی واقعی حرام ہے؟

اس سوال کے جواب میں یعنی رسم عثمانی کے التزام یا عدمِ التزام کے بارے میں بھی تین مواقف سامنے آتے ہیں۔ (۶۹)

(۱) وجوبِ التزام یعنی پابندی لازمی ہے، خلاف ورزی ناجائز ہے۔

(۲) جوازِ عدمِ التزام یعنی پابندی لازمی نہیں، خلاف ورزی جائز ہے۔

(۳) وجوبِ عدمِ التزام یعنی پابندی جائز نہیں، خلاف ورزی لازمی ہے۔

لہٰذا ہر ایک موقف کے قائلین اور ان کے دلائل کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

پہلا موقف: کتابت مصاحف میں رسم عثمانی (یا علم الرسم کے اصولوں) کے التزام کے وجوب کے قائلین میں جمہور علماءِ سلف و خلف شامل ہیں۔ یعنی یہ اہل علم کی اکثریت کا موقف ہے۔ اس موقف کی تائید میں امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ (بلکہ بقول جعبری ائمہ اربعہ)، تمام ائمہ رسم (مثل الدانی وغیرہ) اور بیشتر مفسرین و محدثین، عبدالرحمٰن المغربی وغیرہم کے اقوال و آراء پیش کیے جاتے ہیں (۷۰)۔ (تاہم یہ سب قائلین توقیف نہیں ہیں) اور اس موقف کی تائید میں دلائل یہ پیش کیے گئے ہیں کہ:

(۱) آنحضرت ﷺ کے سامنے (اس زمانے میں رائج) رسم کے مطابق قرآن لکھا جاتا رہا اور آنحضرت ﷺ نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت اسی رسم کے مطابق لکھا ہوا قرآن چھوڑا۔ گویا اس رسم کو کم از کم بھی سنت تقریری کی حیثیت تو حاصل ہے۔ اور اگر آنحضرت ﷺ کے کتابتِ قرآن سے شغف اور اس کے اہتمام کو دیکھا جائے تو یقیناً اسے واجب بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

(۲) عہد صدیقی اور عہد عثمانی میں مصحف کی کتابت اسی طریقے پر ہوئی، بلکہ ایک ہی کاتب کے ہاتھوں ہوئی۔ اور مصاحفِ عثمانیہ ہی باجماعِ صحابہؓ آئندہ ہمیشہ کے لیے اور سب کے لیے کتابت مصاحف کی بنیاد قرار پائے۔

(۳) آنحضرت ﷺ کے بعد تمام صحابہؓ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین (جن کے زمانے میں رسم قیاسی موجود تھا) سب کا اس رسم پر اتفاق ثابت ہے، کسی سے اس کی مخالفت ثابت نہیں ہے۔ (۷۱) اہلِ تشیع سے بھی اس کی حمایت اور تائید ثابت ہے اور وہ قاری اور کاتب ہر ایک کے لیے اس سے آگاہ ہونا ضروری گردانتے ہیں۔ (۷۲)

(۴) یہ عہدِ نبویؐ کا رسم قرآن ہے۔ اس وجہ سے اسے ایک تاریخی اہمیت بلکہ تقدیس اور تکریم کا درجہ بھی حاصل ہے اور مسلمانوں پر اس کی حفاظت واجب ہے۔ (۷۳) اور اسی غرض کے لیے علم الرسم جیسا مہتم بالشان علم وجود میں آیا۔

(۵) یہی رسم اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ عہدِ نبویؐ سے لے کر آج تک قرآن کریم کی کتابت میں ایک حرف تک کا تغیر و تبدل نہیں۔ (ہجاءِ کلمات کے حروف گن کر جوڑنے کا نام ہی تو ہے) بلکہ کسی نبرہ (دندانہ) تک کو بھی نہیں بدلا گیا (مثلاً بِاَیۡیْد 'بِاَییّکم میں) حتیٰ کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس رسم میں فنی قواعد کے لحاظ سے کوئی نقص یا کمی رہ گئی تھی تو اس کی بھی اصلاح نہیں بلکہ حفاظت کی گئی ہے۔ اور نہ ہی محض اس وجہ سے کبھی قرآن غلط پڑھا گیا ہے۔

دوسرا موقف: رسم قرآنی کے عدمِ التزام کے جواز کے قائلین کا موقف یہ ہے کہ کتابتِ مصاحف میں رسم عثمانی کے التزام کی بجائے املاء قیاسی یا قواعد عامہ کا اتباع اور استعمال جائز ہے۔ اس نظریہ کے حامیوں میں علامہ ابن خلدون اور قاضی ابوبکر الباقلانی کا نام لیا جاتا ہے۔ مؤخر الذکر خصوصاً اس نظریہ کے پر جوش حامی تھے۔ [۷۴]
اس موقف کے حق میں یہ دلائل پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) رسم یا املاء کی حیثیت اشارات اور علامات کی ہے' لہٰذا جو طریق املاء بھی درست تلفظ پر دلالت کرتا ہے اسی کا اتباع صواب ہے۔

(۲) رسم عثمانی قرآن کی درست قراءت میں صعوبت اور التباس کا باعث بنتا ہے۔ تیسیر اور عدمِ حرج کے اصولِ شرعی کی بنا پر جدید اور متعارف طریق املاء کو اختیار کرنا کیوں ناجائز قرار دیا جا سکتا ہے؟

(۳) قرآن' سنت یا اجماعِ امت سے کتابتِ مصحف میں کسی خاص رسم کا قطعی وجوب ثابت نہیں ہے اور نہ ہی آنحضرت ﷺ سے کسی کاتبِ وحی کو املاء اور ہجاءِ کلمات میں کوئی خاص طریقہ اختیار کرنے کی کوئی ہدایت ثابت ہے۔

(۴) قرآن و حدیث میں کسی متعین رسم کی پابندی کا حکم یا اس کی خلاف ورزی سے نہی اور/یا اس خلاف ورزی پر کوئی وعید یا تہدید وارد نہیں ہوئی ہے۔

تیسرا موقف: وجوبِ عدمِ التزام کے قائلین کا موقف یہ ہے کہ عوام الناس کے لیے کتابت مصاحف میں عام املائی قواعد کی پابندی کرنی چاہیے اور رسم عثمانی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ رسم عثمانی کی پابندی کے ساتھ لکھے جانے والے مصاحف صرف خواص اور اہل علم کے لیے مختص ہونے چاہئیں۔ [۷۵] اس نظریہ کے قائلین میں بدرالدین الزرکشی (صاحبِ البرھان) اور شیخ عزالدین بن عبدالسلام شامل ہیں۔ اور اس موقف کے صرف پہلے ''عوامی قرآن'' والے حصے کے قائلین بلکہ حامیوں میں مصر کے جدید علماء میں سے الشیخ حسین والی اور احمد حسن الزیات کا شمار بھی ہوتا ہے۔ [۷۶] اس موقف کے حق میں یہ دلائل پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) رسمِ عثمانی کے مطابق کتابت عوام کے لیے تلاوت اور قراءتِ قرآن میں دقت اور مشقت کا باعث بنتی ہے اور ان سے بعض دفعہ سنگین غلطی کا ارتکاب ہو سکتا ہے جو الٹا باعث گناہ ہوتا ہے۔

(۲) تاہم رسم عثمانی کو محض یادگارِ سلف ہونے کی حیثیت سے باقی رکھنا بھی ضروری ہے۔ ایک چیز کا یادگار رہنا

اور بات ہے اور روزمرہ کے استعمال میں لانا دوسری بات ہے۔ اس لیے ''رسمِ عثمانی'' والے مصاحف صرف خواص اہلِ علم تک محدود رہنے چاہئیں۔

اور غالباً اسی نظریہ سے متاثر ہونے اور اسی رفع التباس کی بنا پر ہی اہل مشرق (ایشیائی ممالک) میں بہت سی چیزوں میں رسم عثمانی سے بالفعل (عملاً) خلاف ورزی کا رواج ہوگیا ہے (۷۷) اور اہلِ مغرب (افریقہ) میں بھی رسم عثمانی کا التزام اس وجہ سے پایا جاتا ہے کہ اس کے بارے میں امام مالکؒ کا واضح قول ثابت ہے اور افریقہ اور مغرب میں زیادہ تر فقہ مالکی کا اتباع کیا جاتا ہے۔ (۷۸)

ان دو نظریوں (جواز عدمِ التزام اور وجوبِ عدم التزام) کے قائلین کا ایک مشترکہ استدلال یہ بھی ہے کہ جزیرہ نمائے عرب میں کتابت عہد نبوی سے تھوڑا عرصہ پہلے متعارف ہوئی تھی اور اس کے جاننے والوں کی تعداد بھی محدود ہی تھی۔ گویا عربی املاء نزولِ قرآن کے وقت اپنے عہد طفولیت میں تھی اور کتابت میں حاذق اور ماہر لوگ کم ہی تھے' اس لیے اس میں قواعد کے لحاظ سے یکسانیت اور پختگی ابھی نہیں آئی تھی (۷۹)۔ لہٰذا ایک مقدس اور متبرک یادگار کے طور پر اس (رسم) کی حفاظت تو ضرور ہونی چاہیے مگر اسے معمول بہ بنانے میں کئی مفاسد ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان مؤخر الذکر دو نظریوں کے حامیوں میں سے کسی نے صحابہؓ یا رسم المصحف کے خلاف کوئی ہرزہ سرائی نہیں کی (جس کے مرتکب دو مصری تجدد پسند عبدالعزیز فہمی اور مؤلف ''الفرقان'' ہوئے ہیں) (۸۰) بلکہ ان کا موقف اور مقصد صرف قراءتِ قرآن میں سہولت پیدا کرنا اور التباس اور خطا کے امکانات کو روکنا ہی معلوم ہوتا ہے۔

(۲۰) بہرحال اُمت کی غالب اکثریت کتابتِ مصحف میں رسم المصحف یا رسم عثمانی کی پابندی کی قائل رہی ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جن مصاحف کے اندر رسم عثمانی کی (عموماً غیر ارادی) خلاف ورزی موجود ہوتی ہے ان کے بھی سرورق پر ''مطابق رسم عثمانی'' لکھا ہوتا ہے (۸۱)۔ اہل مشرق میں جو رسم عثمانی کی خلاف ورزی کی زیادہ مثالیں ملتی ہیں' اس کی بڑی وجہ نقل صحیح کا التزام کرنے کی بجائے حافظہ اور قیاس سے کام لینا ہے۔ پیشہ ورانہ عجلت بھی اس کا باعث بنتی ہے اور بڑا سبب کُتّابِ مصاحف کی کم علمی اور کتابت کی ماہرانہ نگرانی اور پڑتال کا فقدان ہے۔ مصاحف کے **مصححین** حضرات بھی رسم کی اغلاط سے یا تو خود بھی بے خبر ہوتے ہیں یا رسم کی بجائے حرکات کی اغلاط پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ نظریاتی حد تک لوگ ہمیشہ رسم عثمانی کے التزام کے قائل رہے ہیں' بلکہ محتاط کاتب نقل صحیح کی پابندی بھی کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ منقول عنہ نسخہ میں ہی اغلاط موجود ہوں۔ (۸۲)

دورِ طباعت میں جب رسم عثمانی کی (عملی) مخالفت کی مثالیں بکثرت سامنے آنے لگیں (قلمی دور میں ان کا دائرہ محدود تھا) تو اہل علم میں اس کے تدارک کا داعیہ پیدا ہوا' جس کے نتیجے میں علم الرسم کے قواعد کی پابندی پر مبنی بعض مصاحف تیار ہوئے (۸۳) جن میں مصری' شامی' سعودی' تونسی اور لیبی مصاحف قابل ذکر ہیں۔ تجدد پسندوں کی انتہا پسندی کے خلاف ردعمل کے طور پر بھی رسم عثمانی کے حق میں داعیہ کی تجدید کا عمل شروع ہوگیا ہے۔

جہاں تک رسم عثمانی کی وجہ سے قراءت میں التباس والے اعتراض کا تعلق ہے تو اس کا ایک جواب یہ ہے کہ علم الضبط کے ذریعے اس مشکل پر مکمل قابو پا لیا گیا ہے اور یوں بھی قرآن کریم کی تعلیم صرف کتابت پر کبھی منحصر نہیں رہی۔ اس کے لیے عہد نبوی سے جاری تلقی وسماع کے طریقے پر استاد یا شیخ سے شفوی طور پر (زبانی) تلفظ اور اداء کا سیکھنا ناگزیر ہے۔ بلکہ اس طریقے کے بغیر تو آپ کسی بھی زبان کا پڑھنا یا بولنا نہیں سیکھ سکتے۔

عرب ممالک کے خواندہ لوگوں کے لیے رسم الخط کی ثنویت (روزمرہ میں رسم قیاسی اور تلاوت میں رسم عثمانی سے واسطہ پڑنا) التباس اور صعوبت کا باعث بنتی ہے۔ ورنہ دنیا میں لاکھوں (بلکہ شاید) کروڑوں ایسے مسلمان ہیں جو اسی رسم عثمانی کے مطابق (بیشتر مطابقت ہی ہوتی ہے) لکھے ہوئے مصاحف سے اپنے علاقے میں رائج علاماتِ ضبط کی بنا پر ہمیشہ درست تلاوت کرتے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں ''عوام'' کا نام تو محض ایک ''نعرہ'' کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ورنہ ضرورت تو پڑھے لکھے عربی دانوں کو رسم قرآن سے شناسا کرنے کی ہے۔ رسم قرآنی کو ترک کرنا اس کا کوئی علاج نہیں ہے' بلکہ اس کے مفاسد بہت زیادہ ہیں۔[۸۴] جب کہ رسم عثمانی کے التزام میں متعدد علمی اور دینی فوائد کا امکان غالب ہے۔[۸۵]

(۲۱) البتہ رسم عثمانی کے بارے میں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ اس کی بنیاد روایت پر ہے اور روایت میں اختلاف کا پیدا ہونا ایک طرح سے ناگزیر ہے۔ یہاں بھی اختلافِ روایات موجود ہے۔ خود مصاحفِ عثمانیہ یا مصاحفِ امصار کے اندر طریق ہجاء اور املاء کے اختلافات سے علم الرسم کی کتابوں میں بحث کی جاتی ہے اور کتب رسم میں ایک اختلاف بیان کر کے عموماً ساتھ یہ بھی لکھ دیا جاتا ہے کہ اب ہمارے ہاں فلاں صورت پر عمل کیا جاتا ہے۔ مثلاً المارغنی نے لکھا ہے کہ اس کی شرح مورد کی بنیاد ''**بیان ماجری به العمل فی قطرنا التونسی**'' (اہل تونس کے معمول بہ قواعد کا بیان) ہے۔ اسی طرح علی محمد الضباع نے اکثر جگہ اختلافِ روایت بیان کر کے ساتھ اس قسم کے فقرے لکھے ہیں کہ ''**جری علیه المغاربة**'' (اہل مغرب کا عمل اس پر ہے) یا مثلاً ''**علیه جری عملنا**'' (ہمارا عمل اس پر ہے) یا مثلاً ''**وعلیه العمل**'' (اور عمل اس پر ہے)[۸۶] وغیرہ۔

پھر علماء رسم میں کسی اختلاف کی صورت میں ترجیح راجح کے اصول بھی بعض دفعہ مختلف ہوتے ہیں' مثلاً مصری' سعودی اور شامی علماء الدانی کے مقابلے پر (بصورت اختلاف) اس کے شاگرد ابوداؤد کے قول کو ترجیح دیتے ہیں (مصری' شامی اور سعودی مصاحف اسی اصول پر تیار ہوئے ہیں)۔ مگر لیبیا والے ابوداؤد کے مقابلے پر الدانی کے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ لیبیا سے حال ہی میں شائع ہونے والے ''**مصحف الجماهیریه**'' میں کم وبیش ۱۳۶ مقامات پر الدانی کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے مصری یا سعودی مصحف کی (رسم میں) مخالفت کی گئی ہے[۸۷]۔ اس مخالفت سے قراءت یا تلفظ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(۲۲) پاکستان میں حکومت اور ناشرین قرآن دونوں ہی رسم قرآنی یا رسم عثمانی کی حقیقت اور اس کے تقاضوں سے بے خبر ہیں۔ سعودی علماء علم الضبط اور علم الرسم میں فرق ہی نہیں کر سکے اور وہ اپنے یا عرب ملکوں کے ضبط کو وحی

کا درجہ دیتے ہیں۔ چنانچہ اس کے مخالف ضبط والے مصاحف کا اپنی مملکت میں داخلہ بند کر دیا ہے اور عوام کے لیے تلاوتِ قرآن جیسے کام میں رکاوٹیں اور مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ ☆

ان تمام امور کو سامنے رکھتے ہوئے ضرورت اس امر کی محسوس ہوتی ہے کہ پاکستان میں اہل علم کا ایک بورڈ (ضروری نہیں کہ وہ منظور شدہ سرکاری ''علماء'' ہوں) علم الرسم کی روشنی میں متفق علیہ کلمات کی ایک فہرست تیار کرے اور پھر مختلف فیہ کلمات کی ایک پوری فہرست بنائی جائے۔ خصوصاً جن کا تعلق کوفی مصحف یا قراءت حفص سے ہو' کیونکہ اس علاقے میں یہی رائج ہیں۔ اور اگر باقی تمام مصاحف پر مبنی اور رائج رسماً مختلف فیہ کلمات کی فہرست بھی بن جائے تو یہ ایک مزید علمی خدمت ہوگی۔ اس طرح تمام مختلف فیہ کلمات کی بھی ایک جامع فہرست بن جائے جس میں اختلاف کی تمام مروی صورتیں جمع کر دی جائیں۔ اس کے بعد کتابت مصاحف کی نگرانی کا ایسا بندوبست کر دیا جائے کہ کم از کم متفق علیہ امور کی خلاف ورزی ہرگز نہ ہونے پائے اور مختلف فیہ کلمات کی مروی دو یا تین صورتوں میں سے ہی کسی ایک صورت کا اختیار کرنا لازمی ہو' اور اس میں چاہے اپنے علاقے کے مصحف (یعنی کوفی) کے رسم کو ترجیح دی جائے۔ بہرحال بیان کردہ اور مروی مختلف فیہ صورتوں سے باہر کوئی صورت اختیار نہ کی جائے۔

اگر حکومت پاکستان کو خدا یہ توفیق دے (ویسے یہ اس کی دستوری ذمہ داری بھی ہے) کہ وہ ان اصولوں کے مطابق رسم عثمانی کے التزام پر مبنی ایک نسخہ قرآن (کا مسودہ) تیار کرائے یا بطور نمونہ ہی محدود تعداد میں شائع کر دے' اس کے بعد تمام ناشرین کو رسم کی حد تک اسی کے اتباع کا پابند کر دے[۸۸]۔ البتہ اس کے لیے ضبط کی علامات وہی اختیار کی جائیں جو برصغیر میں عام طور پر رائج ہیں۔ ہاں اگر کہیں اس سے بہتر علامتِ ضبط ملے تو اسے بھی اختیار کر لینا چاہیے' یا ضرورتاً کوئی نئی علاماتِ ضبط ایجاد بھی کی جاسکتی ہیں۔ تاہم عملاً اس کی ضرورت نہیں پڑے گی' کیونکہ ہمارا نظامِ ضبط عرب ملکوں میں رائج ضبط سے زیادہ ترقی یافتہ بھی ہے اور ہمارے لوگوں کے لیے موزوں اور مانوس بھی ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو یہ قرآن کریم کی ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔ ویسے بھی اپنے اسلامی تشخص کی بنا پر پاکستان کا اس معاملے میں اپنے برادر اسلامی ملکوں سے پیچھے رہ جانا کوئی عزت کی بات نہیں ہے۔

حوالے اور حواشی

(۵۰) ذرا دیکھئے: ابن درستویہ ص ۷ تا ۹۔ (فہرست مندرجات) اسی سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ قواعد خمسہ ہی وہاں بھی موجود ہیں۔

(۵۱) ان مؤلفین اور ان کی کتب کا تعارف مقالہ ھذا کے پیراگراف نمبر ۱۱ اور نمبر ۱۲ میں کرایا جا چکا ہے۔

(۵۲) العقیلی ورق ۵/الف

(۵۳) ان کتابوں کا اجمالی ذکر اسی مقالہ کے پیراگراف نمبر ۱۲ میں گزر چکا ہے۔ ارکاٹی اور العقیلی کی کتاب (مخطوطے کا فوٹوسٹیٹ) مقالہ نگار کے پاس موجود ہیں۔ باقی کتابوں کے بارے میں غانم قدوری کے بیان پر اعتماد کیا گیا

ہے۔ دیکھئے: غانم، ص ۱۸۶

(۵۴) مزید وضاحت کے لیے دیکھئے: غانم، ص ۳۴۷۔۳۵۷

(۵۵) سمیر، ص ۲۳۔۲۵، الزرقانی: ص ۳۷۰ و ۳۷۵، الکردی، ص ۱۹۳ اور خصوصاً ص ۲۲۵۔۲۲۷۔ ان میں سے اکثر نے صاحب الابریز شیخ عبدالعزیز الدباغ کا ایک اقتباس بھی نقل کیا ہے۔

(۵۶) نمونہ کے لیے دیکھئے: البرہان، ص ۳۸۰ بعد اور الکردی، ص ۵۴ ابعد۔

(۵۷) الکردی، ص ۲۲۴ بعد۔ خصوصاً الکردی کے ایک سوال کے جواب میں حبیب اللہ شنقیطی مرحوم کا خط جو مؤلف نے پورا شائع کر دیا ہے۔ نیز مؤلف نے نظریۂ توقیف کے ناقابل قبول ہونے پر نہایت عمدہ دلائل دیے ہیں۔ طوالت کا خوف نہ ہوتا تو ہم یہ پوری بحث مقالہ میں لے آتے جو الکردی، ص ۹۸۔۲۰۱ پر دیکھی جاسکتی ہے۔

(۵۸) ہم نے یہاں ابن خلدون کی رائے کی صرف تلخیص پیش کی ہے۔ مکمل بحث مقدمہ، ص ۴۷۷۔۴۸۷ پر دیکھی جاسکتی ہے۔

(۵۹) اس کی ایک مثال سمیر، ص ۲۱ پر ملتی ہے جہاں مؤلف نے ابن خلدون کا ادھورا اقتباس دے کر اس کے نظریہ کو ''افراط'' اور صحابہؓ کی شان کے منافی قرار دیا ہے۔

(۶۰) الفرقان، ص ۵۴ تا ۹۱۔ نیز دیکھئے غانم، ص ۲۱۲، جہاں اس کتاب کا پورا قصہ لکھا ہے۔

(۶۱) اس کی ایک مثال مصری مؤلف عبدالجلیل عیسیٰ ہیں، جنھوں نے ابن خلدون کو داد دی ہے۔ دیکھئے المیسر (مقدمہ) ص ''ی'' تا ''ل''

(۶۲) یہ فہمی صاحب، مصطفیٰ کمال کی طرح، عربی کو بھی بحروف لاطینی لکھنے کے پرجوش حامی تھے، اس کے لیے اس نے ایک کتاب ''**الحروف اللاتینیة لکتابة العربیة**'' (قاہرہ ۱۹۴۴ء) لکھی جس میں اس نے **رسم المصحف** کو **سخیف** (احمقانہ) لکھا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے غانم، ص ۲۱۲۔

(۶۳) اردو میں غالباً اب تک اس موضوع پر بھی کوئی قابل ذکر تحقیقی کام (یا کسی ایسے کام کا ترجمہ تک) نہیں ہوا ہے۔ انگریزی (اور بعض دوسری یورپی زبانوں میں بھی) اور عربی میں اس پر اچھا مواد دستیاب ہے، مثلاً صلاح الدین المنجد، سہیلہ الجبوری، نبیہ عبود، صفدی، ماری شمل اور غانم قدوری کی تالیفات قابل ذکر ہیں۔

(۶۴) نامی، ص ۷، عبود ۲، ۳، ۱۴، ذنون ص ۷ بعد اور نقشبندی، ص ۲۰۳ بعد۔

(۶۵) المنجد، ص ۱۹ اور المورد، ص ۳۹۔۴۱

(۶۶) اس کی مثال کچھ ایسی ہے، جیسے ہمارے ہاں انگریزی کے دو ہجاء، برطانوی اور امریکی رائج ہیں۔ بلکہ اردو کے بھی دو ہجاء چلتے ہیں، ایک عام معروف ہجاء اور دوسرا انجمن ترقی اردو کا سرکاری ہجاء۔

(۶۷) دیکھئے، مقالہ ھذا کا حاشیہ نمبر ۲۴

(۶۸) رسم قیاسی کی اتنی ترقی اور استحکام کے باوجود املاء کے بعض طریقوں میں رسم قیاسی کے مقابلے پر آج بھی رسم قرآنی زیادہ علمی اور زیادہ سائنٹفک ہے، مثلاً ''اشتریہ'' کے قرآنی رسم کے مقابلے پر رسم قیاسی کا ''اشتراہ'' علمی اعتبار سے یقیناً ناقص ہے۔ مزید مثالوں کے لے دیکھئے مقالہ ہٰذا کے پیراگراف نمبر ۹ کے آخر پر دی گئی فہرست کلمات۔

(۶۹) القاضی، ص ۷۹ بعد، الخلیفہ، ص ۲ اور مجلہ الکلیہ، ص ۳۴۲ بعد۔

(۷۰) سمیر، ص ۱۸۔۲۰، مجلہ الکلیۃ، ص ۳۴۲، الزرقانی، ص ۳۷۲۔

(۷۱) القاضی، ص ۸۴

(۷۲) نامۂ آستان، ص ۱۵، تجوید القرآن، ص ۷۔

(۷۳) یہ ''حفاظت ورثہ'' والی بات جذباتی ہی نہیں، اپنے اندر ایک تہذیبی بلکہ قانونی اہمیت بھی رکھتی ہے۔ بر سبیل تذکرہ مصر کے ایک ناشر کے خلاف رسم قیاسی کے ساتھ لکھا ہوا ایک مصحف چھاپنے پر مقدمہ چلا۔ عدالت نے ناشر کے خلاف فیصلہ دیا اور نسخہ کی ضبطی کا حکم جاری کیا۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں ایک ''نقطہ توجہ'' یہ لکھا کہ ''آثار سلف کی حفاظت ترقی یافتہ اقوام کا فریضہ اولین ہے''۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز شیکسپیئر (یا دوسرے قدیم شعراء مثل چوسر وغیرہ) کا کلام ان ہی کے زمانے کے ہجاء وغیرہ کے ساتھ چھاپنا ضروری خیال کرتے ہیں اور وہ کسی طابع یا ناشر کو اس کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں دیتے، حالانکہ تین چار سو سال میں انگریزی زبان بدل کر کچھ سے کچھ ہو چکی ہے، تو پھر قرآن کے بارے میں یہ اجازت کیسے دی جا سکتی ہے؟ واقعہ کی اصل روایت کے لیے دیکھئے: القاضی، ص ۸۶۔۸۷۔

(۷۴) الزرقانی، ص ۳۷۳۔۳۷۴۔ جہاں الانتصار للباقلانی کا ایک طویل اقتباس بھی دیا گیا ہے۔

(۷۵) القاضی، ص ۷۹۔۸۰، مجلّہ الکلیہ، ص ۳۴۸۔ قریباً یہی بات امام مالکؒ نے کہی تھی کہ بچوں کی تعلیم کے لیے رسم عثمانی سے ہٹ کر لکھنا جائز ہے (دیکھئے: دلیل، ص ۲۴)

(۷۶) القاضی، ص ۸۲۔۸۳

(۷۷) القاضی، ص ۸۰ (بحوالہ التبیان)، الکردی، ص ۱۹۷۔۱۹۸۔

(۷۸) افریقی ممالک میں بچہ جتنا حصہ قرآن پڑھتا ہے وہ تختی پر نقل کر کے استاد کو دکھاتا بھی ہے، بلکہ اس مقصد کے لیے وہاں حروف سے بھی پہلے مکمل کلمات کا لکھنا سکھایا جاتا ہے۔ اس چیز سے وہاں مصحف کی نقل صحیح اور رسم عثمانی کی حفاظت کی روایت قائم ہوگئی ہے، جسے بوجوہ اہل مشرق برقرار نہیں رکھ سکے۔

(۷۹) القاضی، ص ۸۱۔ ہم اس پر ابھی پیراگراف ۱۸ کے آخر پر تنقید اور تبصرہ کر چکے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ دوبارہ اسے بھی مستحضر کر لیا جائے۔

(۸۰) ان دونوں کے متعلق پیراگراف ۱۸ میں ''دوسرا نظریہ'' کے تحت بات ہو چکی۔ نیز دیکھئے حاشیہ نمبر ۶۰ مقالہ ھذا۔

(۸۱) مثلاً راقم الحروف کے پاس بمبئی سے مطبوعہ دو مصحف (ایک ۱۲۸۹ھ کا اور دوسرا ۱۳۰۴ھ کا) ایسے موجود ہیں جن پر صرف رسم عثمانی نہیں، بلکہ ''مصحف سیدنا عثمان'' کے رسم سے موافقت کا خصوصی ذکر ہے، مگر وہ رسم کی اغلاط سے یکسر مبرا نہیں ہیں۔

(۸۲) راقم الحروف نے ایک دفعہ پیر عبدالحمید مرحوم سے (جو تاج کمپنی کے مشہور کاتب مصاحف تھے) یہ پوچھا کہ ''آپ کتابت مصحف میں رسم عثمانی کا التزام کس طرح کرتے ہیں؟'' انہوں نے رسم عثمانی سے یکسر بے خبری کا اظہار کیا۔ میرے دوبارہ سوال پر کہ ''پھر آپ کے پاس کلمات قرآن کی ٹھیک املاء اور درست ہجاء کا کیا معیار ہے؟'' تو انہوں نے بتایا کہ ''میں اور کچھ نہیں جانتا، صرف انجمن حمایت اسلام کا مطبوعہ نسخہ قرآن سامنے رکھ کر ٹھیک ٹھیک نقل کی کوشش کرتا ہوں''۔ انجمن کا یہ نسخہ اپنی صحت کی بجا شہرت رکھتا ہے، اگرچہ رسم کے نقطہ نظر سے وہ بھی اغلاط سے خالی نہیں ہے۔

اس کے مقابلے پر راقم الحروف ہی کے پاس ضلع جھنگ کے ایک صاحبِ علم کاتب کا لکھا ہوا ایک خاندانی

قلمی مصحف ایسا بھی ہے جس میں کاتب خاص خاص جگہوں پر بین السطور یا حاشیہ میں ''بحذف الف'' یا ''بزیادۃ الواؤ'' وغیرہ کا نوٹ دے کر بعض دفعہ ساتھ کسی اہم کتاب الرسم مثلاً ''العقیلہ'' کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔

(۸۳) اس قسم کے مصاحف کی تیاری کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لیے دیکھئے: القاضی' ص۹۱۔۹۴' غانم' ص۶۰۱۔۶۰۹۔

(۸۴) مزید وضاحت کے لیے دیکھئے: الزرقانی' ص۳۹۰ بعد۔

(۸۵) تفصیل کے لیے دیکھئے: سمیر' ص۲۲۔۲۳' القاضی' ص۸۶۔۸۷' اور الزرقانی ص۳۶۶ بعد۔

(۸۶) دیکھئے: دلیل ص۵' اور سمیر ص۳۶' ۴۰' ۵۰' ۶۷ اور ۷۶ وغیرہ متعدد مقامات پر۔

(۸۷) دیکھئے: مقالہ ھٰذا کا حاشیہ نمبر۴۲۔

(۸۸) الازہر کی مجلس فتویٰ کی طرف سے ۱۳۵۵ھ میں (بذریعہ مجلۃ الازہر) یہ فتویٰ جاری ہوا تھا کہ رسم عثمانی کی پابندی کے بغیر قرآن کریم کی طباعت ناجائز ہے۔ اس کے بعد سے طباعت مصاحف میں اس التزام کے بارے میں ایک تحریک سی پیدا ہوگئی ہے' مگر جدید اور قیاسی املاء کے عادی خواندہ لوگوں کے لیے رسم قرآنی میں کیسے سہولت پیدا کی جائے؟ اس سوال کا ایک جواب تو دقت نظر سے اختیار کردہ علاماتِ ضبط کا نظام ہے۔ دوسرا علاج اس کا الازہر والوں نے ۱۳۶۸ھ میں ایک دوسرے فتویٰ کی صورت میں دیا جس کی رو سے یہ جائز قرار دیا گیا کہ اصل متن تو رسم عثمانی کے مطابق ہی رہے مگر نیچے ذیل (فٹ نوٹ) کے طور پر ''مشکل'' کلمات کو جدید املاء یا رسم معتاد کی شکل میں الگ بھی لکھ دیا جائے۔ چنانچہ عبدالجلیل عیسیٰ کے حاشیہ کے ساتھ ''المصحف المیسر'' اسی اصول پر علماء الازہر کی نگرانی میں تیار ہو کر شائع ہوا تھا۔ یہ بھی اس مسئلہ کا ایک عمدہ حل ہے۔ تاہم غالباً پاکستان میں اس کی ضرورت نہیں۔ یہ پڑھے لکھے عربوں کے مسئلہ کا حل ہے۔ ہمارے ہاں رسم عثمانی کا مکمل التزام درکار ہے اور اس کے پڑھنے کے لیے ہمارا نظام ضبط اور استاد کی تعلیم کافی ہے۔

مفتاح المراجع

مقالہ کی تیاری میں جن کتب اور مجلّات وغیرہ سے مدد لی گئی ہے' تکرار میں طوالت سے بچنے کے لیے ان کے حوالے اختصار کے ساتھ مذکور ہوئے ہیں۔ ذیل میں ان تمام حوالوں کی ''مفتاح'' ابجدی ترتیب کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ اس میں بیان کتابیات کے روایتی طریقے پر ہر ایک حوالے کے متعلق ضروری معلومات شامل ہیں۔

(۱) البرهان: امام بدرالدین الزرکشی۔ البرهان فی علوم القرآن: عیسی البابی۔ القاهره - ۱۹۵۷ء۔

(۲) البری: عبد اللّٰه خورشید البری۔ القرآن وعلومه فی مصر۔ دار المعارف القاهره' ۱۹۶۹ء۔

(۳) تجوید القرآن: علی بن محمد الحسینی کا رسالہ تجوید القرآن بزبان فارسی۔ یہ رسالہ ایک ایرانی مصحف مترجم بترجمہ آقائی معزی کے ساتھ شامل ہے جسے کتاب فروشی اسلامیہ' تہران نے ۱۳۷۷ھ میں شائع کیا تھا۔

(٤) تلخیص: علی بن عثمان ابن القاصح ـــ تلخیص الفوائد وتقریب المتباعد (شرح العقیله للشاطبی) مصطفی البابی۔ القاهره' ۱۳۶۸ء

(٥) الخلیفه: دکتور یوسف الخلیفہ ابوبکر السودانی کا مقالہ ''الرسم القرآنی وصعوبات التعلیم الناتجة عنه'' جو سعودی عرب کے اخبار المدینة المنوره کی اشاعت ۱۲ شوال ۱۴۰۱ھ میں شائع ہوا تھا۔

(٦) ابن درستویه:عبد اللّٰہ بن جعفر الشهیر بابن درستویه۔ کتاب الکتّاب۔مطبعة کاثولیکیه' بیروت'١٩٢٧ء۔

(٧) دلیل : ابراهیم بن احمد المارغنی۔دلیل الحیران شرح مورد الظمآن۔مکتبة الکلیات الزهریة القاهره۔ ت (سنه ندارد)۔

(٨) ذنون: یوسف ذنون الموصلی کا مقالہ ''قدیم وجدید فی اصل الخط العربی وتطوره فی عصوره المختلفة''۔ جو عراق کے مجلّہ ''المورد'' العدد الرابع ١٤٠٧ھ میں شائع ہوا۔

(٩) الزرقانی: عبد العظیم الزرقانی' مناهل العرفان فی علوم القرآن۔عیسی البابی' القاهره'١٣٧٢ھ۔

(١٠) الزرکلی: خیر الدین الزرکلی' الاعلام۔الطبعة الثالثه۔ بیروت'ب۔ت(سنه ندارد)

(١١) سعودی مصحف : سعودی حکومت کا شائع کردہ "مصحف المدینة النبویة" ١٤٠٦ھ۔

(١٢) سمیر: علی محمد الضباع "سمیر الطالبین فی رسم وضبط الکتاب المبین"مکتبة ومطبعة المشهد الحسینی۔القاهره 'ب۔ ت (سنه ندارد)۔

(١٣) صبحی: دکتور صبحی صالح'مباحث فی علوم القرآن'دار العلم للملایین۔بیروت'١٩٦٤ء۔

(١٤) عبود : انگریزی مراجع میں Abbot Nabia دیکھئے۔

(٥١) العقیلی : ابن الطاهر اسماعیل بن ظافر العقیلی۔"فی مرسوم خط المصاحف" ادارہ تحقیقات اسلامی کا مخطوط(مقالہ کا پیراگراف ١٢(٦) اور حاشیہ ٤٣ بھی ملاحظہ فرمایئے۔)

(١٦) غانم : غانم قدوری الحمد' رسم المصحف'دراسة لغویة تاریخیة۔ بغداد'١٤٠٢ھ ۔ یہ کتاب عراق کی ہجرہ کمیٹی نے شائع کی ہے۔

(١٧) الفرقان : محمد محمد عبد اللطیف (ابن الخطیب)الفرقان'مطبعة دارالکتب المصریه' القاهره'١٣٦٧ھ ١٩٤٨ء (حاشیہ ٦٠ اور ٨٠ پر بھی نظر ڈال لیجیے)۔

(١٨) الفهرست : ابن الندیم' الفهرست' المطبعة الرحمانیه بمصر' القاهره'١٣٤٨ھ۔

(١٩) القاضی : عبد الفتاح القاضی' تاریخ المصحف الشریف' مکتبة ومطبعة المشهد الحسینی' القاهره' ب۔ت(سنه ندارد)

(٢٠) قلقشندی : ابو العباس احمد بن علی القلقشندی۔صبح الاعشی فی کتابة الانشاء ۔وزارة الثقافة والارشاد القومی۔مصر ١٩٦٣ء۔

(٢١) الکردی : محمد طاهر بن عبد القادر الکردی الخطاط۔تاریخ القرآن۔غرائب رسمه وحکمه۔مصطفی البابی۔القاهره'١٣٧٢ھ۔ ١٩٥٣ء

(٢٢) لبیب : دکتور لبیب السعید۔ الجمع الصوتی الاول للقرآن'دار المعارف القاهره'ب ت ۔

(٢٣) لیبی مصحف : حکومت لیبیا کا شائع کردہ "مصحف الجماهیریة" طرابلس'١٩٨٦ء۔

(٢٤) مجلة : مجلة کلیة القرآن الکریم والدراسات الاسلامیة بالجامعة الاسلامیة' (المدینة المنوره) العدد الاول' ١٤٠٢ھ۔

(٢٥) المصاحف : ابن ابی داود السجستانی۔کتاب المصاحف۔المطبعة الرحمانیه بمصر'١٣٥٥ھ۔ ١٩٣٦ء۔

(٢٦) مصری مصحف:حکومت مصر کا شائع کردہ "مصحف الملك" القاهره'١٣٧٧ھ۔

(۲۷) مقدمہ : علامہ عبد الرحمٰن ابن خلدون۔مقدمہ کتاب العبر'دار الکتاب اللبنانی'بیروت'۱۹۶۱ء۔
(۲۸) المنجد : دکتور صلاح الدین المنجد' دراسات فی تاریخ الخط العربی' منذ بدایته الی نهایة العصر الاموی' دارالکتاب الجدید' بیروت'۱۹۶۱ء۔
(۲۹) المورد : وزارة الثقافة والاعلام۔ عراق کے سرکاری مجلّہ المورد کا عدد خاص'العدد الرابع'۱۴۰۷۔۱۹۸۶ء (المورد کے ۱۹۸۱ء کے ایک عدد سے بھی کچھ استفادہ کیا گیا ہے'اس کا ذکر وہیں کر دیا گیا ہے۔)
(۳۰) المیسر : عبد الجلیل عیسی' المصحف المیسر' دار القلم'القاهره'۱۳۸۲ھ۔
(۳۱) نامی: خلیل یحییٰ نامی کا مقالہ ''اصل الخط العربی وتاریخ تطوره الی ما قبل الاسلام'' جو مجله کلیة الآداب' الجامعة المصریة کے شمارہ مئی ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا۔
(۳۲) نخبة : عبد الفتاح الخلیفه۔نخبة الاملاء ۔مطبعة المعاهد بمصر'القاهره'۱۳۴۵ھ۔ ۱۹۲۶ء
(۳۳) نقشبندی: اسامه ناصر النقشبندی کا مقالہ مبدأ ظهور الحروف العربیة وتطورها لغایة القرن الاول الهجری'' جو عراق کے مجلّہ المورد'العدد الرابع ۱۴۰۷ھ میں شائع ہوا ہے۔
(۳۴) نامۂ آستان: نامۂ آستان قدس' مشہد۔ایران' شمارہ ۱و۲' دورہ نہم (محرم صفر ۱۳۹۱ھ)۔
(۳۵) یوسف علی: دیکھئے انگریزی میں Yusuf Ali

ENGLISH REFERENCES

1. *ABBOT, NABIA: The Rise of the North Arabic Script and its K ur'anic Development, Chicago, 1939.*
2. *DENFFER, Ahmad Von: An Introduction to the Sciences of the Quran, Islamic Foundation, Leicester (U.K), 1973.*
3. *Yusuf Ali, Allam.A: The Holy Quran, Translation & Commentary, Islamic Centre, Washington D.C (N.D).*

شرک کی حقیقت، اقسام اور دور حاضر کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجئے

حقیقت و اقسامِ شرک

ڈاکٹر اسرار احمد

اشاعت خاص 100 روپے، اشاعت عام 60 روپے

اسلامی ضابطۂ میراث واستحقاقِ میراث
اور تقسیمِ میراث میں کوتاہی: ایک عظیم گناہ

پروفیسر حافظ قاسم رضوان ☆

جب کسی شخص کا انتقال ہوجائے تو شریعت اسلامی کا حکم ہے کہ انتقال کے فوراً بعد اس کے مال میں سے چار حقوق ادا کیے جائیں:

(۱) متوفّٰی کے کفن دفن کے متوسط اخراجات نکالے جائیں۔ اگر کوئی دوسرا شخص اپنی طرف سے اس کا انتظام کر دے تو پھر متوفی کے ترکہ سے یہ رقم نہ لی جائے۔

(۲) مرنے والے کے ذمہ اگر کسی کا کوئی قرض واجب الادا ہو تو اس کو پہلے ادا کیا جائے' خواہ قرضوں کی ادائی میں سارا مال خرچ ہوجائے۔ اسی طرح اگر مرحوم نے اپنی بیوی کا مہر ادا نہ کیا ہو اور بیوی نے خوش دلی سے معاف بھی نہ کیا ہو' تو یہ بھی قرض ہے' جسے ادا کرنا لازم ہے۔ خیال رہے کہ بیوی کو یہ مہر اس کے حصہ میراث کے علاوہ ملے گا اور اس کا حصہ میراث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۳) تیسرا حق وصیت کا ہے' یعنی ادائیگی قرض کے بعد دیکھا جائے گا کہ متوفی نے کوئی جائز وصیت کی ہے یا نہیں۔ اگر کوئی جائز وصیت کی ہو تو باقی مال و جائیداد کے ایک تہائی (۱/۳) کی حد تک ان وصیتوں کو پورا کیا جائے گا۔ اگر وصیت تہائی مال سے زیادہ کی ہو تو حدیث کی رو سے ایک تہائی کی حد تک وصیت پوری کرنا ورثاء پر لازم ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا: مجھے بیماری لاحق ہوگئی ہے اور میں مالدار ہوں اور میرا وارث سوائے میری بیٹی کے اور کوئی نہیں' کیا میں اپنا دو تہائی مال صدقہ نہ کر دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں''۔ میں نے عرض کیا کہ نصف؟ آپؐ نے فرمایا: ''نہیں''۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَلثُّلُثُ وَالثُّلُثُ كَثِيْرٌ، اِنَّكَ اَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ اَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِنْ اَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُوْنَ النَّاسَ)) (۱)

''تہائی (مال صدقہ کر سکتے ہو) اور تہائی بھی بہت ہے۔ تو اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑے اس سے بہتر ہے کہ انہیں محتاج چھوڑے کہ لوگوں سے سوال کرتے پھریں۔''

☆ ریٹائرڈ صدر شعبہ اسلامیات ومطالعہ پاکستان' گورنمنٹ کالج آف کامرس' علامہ اقبال ٹاؤن' لاہور

البتہ انتقال کرنے والے کی ناجائز وصیتوں کو پورا کرنا جائز نہیں۔

(۴) مندرجہ بالا ساری ترتیب کے بعد جو مال باقی بچے، اس کو شریعت کے بتائے ہوئے اصولوں اور حصوں کے مطابق ورثاء میں تقسیم کرنا لازم ہے۔

اسلامی ضابطۂ میراث (اصولِ وراثت)

قبل از اسلام عرب اور عجم کی قوموں میں انسان کی صنف ضعیف یعنی یتیم بچے اور صنف نازک یعنی عورتیں ہمیشہ ہی طرح طرح کے ظلم وستم کا شکار رہے ہیں۔ اوّل تو ان کا کوئی حق ہی تسلیم شدہ نہ تھا اور اگر کہیں کوئی حق مان بھی لیا گیا تو مَردوں سے اس کا وصول کرنا اور اسے محفوظ رکھنا ان کے قبضہ قدرت میں نہ تھا۔ اسلام نے پہلے تو ان کو حقوق دلائے اور پھر ان حقوق کی حفاظت کا بھی مکمل انتظام کیا۔ اسی ضمن میں قانون وراثت میں بھی اقوامِ عالَم نے معاشرے کے ان دونوں کمزور اجزاء کو ان کے فطری اور واجبی حقوق سے مکمل طور پر محروم کیا ہوا تھا۔

عرب میں تو یہ اصول ہی بنا لیا گیا تھا کہ وراثت کا مستحق صرف وہ ہے جو گھوڑے پر سوار ہو اور دشمنوں کا مقابلہ کر کے ان سے مالِ غنیمت جمع کرے۔ (رُوح المعانی، ج ۴، ص ۲۱) اب ظاہر ہے کہ یہ دونوں صنف یعنی بچے اور عورتیں اس اصول پر پوری نہیں اتر سکتیں، اس لیے ان کے اصولِ وراثت کی رو سے صرف جوان بالغ لڑکا ہی وارث ہوسکتا تھا۔ لڑکی خواہ بالغ ہو یا نابالغ، مطلقاً وارث نہ سمجھی جاتی، اور لڑکا بھی اگر نابالغ ہوتا تو وہ بھی وراثت کا حق دار نہ ٹھہرتا۔ ہندومت میں بھی عورت کا وراثت (ترکہ) میں کوئی حصہ نہ تھا۔

حضور اکرم ﷺ کی حیات میں حضرت اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا اور انہوں نے دو لڑکیاں، ایک نابالغ لڑکا اور ایک بیوہ وارث چھوڑے۔ عرب کے قدیم دستور کے مطابق ان کے دو چچازاد بھائیوں نے آ کر مرحوم کے پورے مال پر قبضہ کر لیا اور ان کی اولاد اور بیوہ میں سے کسی کو کچھ بھی نہ دیا۔ گویا پورے مال کے وارث حضرت اوسؓ کے دو چچازاد بھائی بن گئے۔ مرحوم کی بیوہ نے یہ بھی چاہا کہ یہ چچازاد بھائی ان کی دونوں لڑکیوں سے شادی بھی کر لیں تاکہ ان کی فکر سے فراغت ہو، مگر انہوں نے یہ بھی قبول نہ کیا۔ اس پر حضرت اوسؓ کی بیوہ نے حضور ﷺ کی خدمت میں آ کر عرضِ حال کیا، اپنی اور بچوں کی بے کسی اور محرومی کی شکایت کی۔ اُس وقت تک چونکہ قرآن پاک میں آیاتِ میراث نازل نہ ہوئی تھیں، اس لیے نبی اکرم ﷺ نے توقف فرمایا۔ آپ ﷺ کو اطمینان تھا کہ وحی الٰہی کے ذریعے اس ظالمانہ رواج اور قانون کو ضرور بدلا جائے گا۔ چنانچہ یہ ابتدائی آیتِ میراث نازل ہوئی: ﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا۝۷﴾ (النساء) ''مَردوں کا بھی حصہ ہے اس میں جو چھوڑ جائیں ماں باپ اور قرابت والے، اور عورتوں کا بھی حصہ ہے اس میں جو چھوڑ جائیں ماں باپ اور قرابت والے تھوڑا ہو یا بہت ہو۔ (یہ) حصہ (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) مقرر کیا ہوا ہے''۔ اس کے بعد

دوسری آیاتِ میراث نازل ہوئیں جن میں حصوں کی تفصیلات ہیں۔ سورۃ النساء کا دوسرا رکوع انہی تفصیلات پر مشتمل ہے (جو اس مضمون کے احاطہ سے باہر ہیں۔) احکامِ قرآنی کے مطابق حضور کریم ﷺ نے مرحوم کے کل ترکہ کا آٹھواں حصہ بیوی کو دے کر باقی سب مال ان کے لڑکے لڑکیوں میں اس طرح تقسیم کر دیا کہ اس کا آدھا لڑکے کو اور باقی آدھے میں دونوں لڑکیاں برابر کی شریک رہیں۔ چچازاد بھائی بمقابلہ اولاد کے چونکہ اَقْرَب نہ تھے‘ اس لیے وہ وراثت سے محروم رہے۔ (۲)

والدین یا قریبی رشتہ دار جو ترکہ چھوڑ جائیں‘ اس میں مردوں اور عورتوں دونوں کا حصہ ہے۔ عورتوں کے حصے کے اہتمام کے لیے یہ اندازِ کلام ﴿مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ﴾ اپنا کر ان کو تنبیہ کر دی گئی جو اس حصے کا لحاظ نہیں رکھتے۔ یہ ﴿مِمَّا تَرَكَ﴾ سے بدل ہے اور اِنْ حرفِ جار کو مکرر ذکر کیا ہے۔ ﴿نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا﴾ یہ مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور تاکید کا فائدہ دے رہا ہے‘ جس طرح ربِّ ارض وسما کا یہ فرمان: ﴿فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ﴾ ظرف کے فاعل سے حال ہے‘ کیونکہ معنی یہ ہیں: ان کے لیے حصہ ثابت ہے‘ اس حال میں کہ یہ قطعی ہے۔ حقیقت میں حال اللہ تعالیٰ کا فرمان مفروضًا ہے‘ لیکن ظاہر کے اعتبار سے نصیبًا کو حال بنایا اور مفروضًا اس کی صفت ہے اور اسے حال موطئہ (تمہید) کہتے ہیں۔ جو اصل حال ہے‘ اس سے پہلے یا اختصاص کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی تقدیرِ کلام یوں ہوگی: اعنی نصیبا مقطوعًا‘ گویا ان پر واجب ہے‘ اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی اجازت نہیں۔ اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ اگر وارث اپنے حصے سے اعراض (انکار) یا براءت کا اظہار کرے تو اس کا حق ساقط (ختم) نہیں ہو جاتا۔ آیت میں والدین کا ذکر جبکہ وہ اقربین میں بھی شامل ہیں‘ ایک تو عظمت شان کے لیے ہے اور دوسرے اس لیے کہ آیت کا سبب نزول والد کی میراث (ترکہ) ہے۔ (۳)

استحقاقِ میراث کا ضابطہ

اسلام نے تقسیم وراثت میں فطری قواعد اور قرابت کے قُرب و بُعد کا لحاظ رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی نظریے کے مطابق ایک خاندان اور برادری کے افراد میں تکافل کی ذمہ داری پائی جاتی ہے‘ اور یہیں سے کفالت پھیل کر عام انسانی کفالت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مشہور قاعدہ ہے: اَلْغُنْمُ بِالْغُرْمِ کہ منافع ذمہ داری کے لحاظ سے ہے۔ چونکہ قرابت دار حاجت کے وقت باہمی کفالت اور ذمہ داری کے مکلّف ٹھہرائے گئے ہیں اور قتل و جرح کے معاملات میں ضامن بنائے گئے ہیں‘ اس لیے عدل و انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ وہ باہم وارث بھی ہوں‘ اور وراثت کا حصہ تضامن و تکافل کے پیش نظر کم و بیش ہوتا رہے۔ اسلامی اصولِ وراثت میں یہی قاعدہ و قانون کارفرما ہے۔

مندرجہ بالا آیت (النساء: ۷) نے وراثت کے چند احکام کے ضمن میں قانونِ وراثت کا ضابطہ واضح کر دیا ہے۔ ﴿مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ﴾ کے دو لفظوں نے وراثت کے دو بنیادی اصول بتلا دیے۔ ایک رشتۂ

ولایت' جو اولاد اور ماں باپ کے درمیان ہے اور جس کو لفظ وَالِدَانِ سے بیان کیا گیا ہے' دوسرے عام رشتہ دار جو لفظ اَقْرَبُوْن کا مفہوم ہے۔ صحیح یہ ہے کہ 'اَقْرَبُوْن' کا لفظ ہر قسم کی قرابت اور رشتہ داری کو حاوی ہے' خواہ وہ رشتہ باہمی ولادت کا ہو' جیسے اولاد اور ماں باپ میں' یا دوسری طرح کا ہو' جیسے عام خاندانی رشتوں میں' یا وہ رشتے جو ازدواجی تعلق سے بنے ہوں' لفظ اقربون ان سب پر حاوی ہے۔ والدین کو ان کی اہمیت اور مقام کی وجہ سے بطور خاص جدا کر دیا گیا۔ پھر اس لفظ نے یہ بھی بتلا دیا کہ مطلق رشتہ داری وراثت کے لیے کافی نہیں ہے' بلکہ اس میں اَقرب ہونا شرط ہے۔ اگر اَقرب کو معیارِ شرط نہ بنایا جائے تو ہر مرنے والے کی وراثت پوری دنیا کی تمام انسانی آبادی پر تقسیم ہونا ضروری ہو جائے گا' کیونکہ سب ایک ماں باپ حضرت آدم اور حواء کی اولاد ہیں۔ گویا دورِ قریب کا کچھ نہ کچھ رشتہ ان سب میں موجود ہے۔ اب بظاہر یہ کام امکان سے باہر ہے' اس لیے ضروری ہوا کہ جب وراثت کا مدار رشتہ داری پر ہو تو اصول یہ بنایا جائے کہ اگر نزدیک ودُور کے مختلف رشتہ دار جمع ہوں تو قریبی رشتہ دار کو بعید پر ترجیح دے کر اَقرب (زیادہ نزدیک) کے ہوتے ہوئے اَبعد (زیادہ دور) کو حصہ نہ دیا جائے۔ البتہ اگر کچھ رشتہ دار ایسے ہوں جو بیک وقت سب کے سب اَقرب قرار دیے جائیں' اگرچہ وجوہ اقربیت ان میں مختلف ہوں' تو پھر یہ سب مستحق وراثت ہوں گے' جیسے اولاد کے ساتھ ماں باپ یا بیوی وغیرہ۔

ایک اور بات اس لفظ اَقْرَبُوْنَ نے یہ بھی بتلائی کہ جس طرح مردوں کو مستحق وراثت سمجھا جاتا ہے' اسی طرح عورتوں اور بچوں کو بھی کسی طور سے اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ رشتہ اولاد کا ہو یا ماں باپ کا' یا دوسری قسم کے رشتے ہوں' ہر ایک میں رشتہ داری کی حیثیت لڑکے اور لڑکی میں یکساں ہے۔ جس طرح لڑکے کی پیدائش ماں باپ سے ہوتی ہے' اسی طرح لڑکی بھی انہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اب حق وراثت کا معیار جب رشتہ پر ہوا' تو چھوٹے بچے یا لڑکی کو محروم رکھنا کسی طور سے بھی روا نہیں ہے۔ اس ضمن میں قرآن مجید کے اسلوب کو دیکھئے کہ لِلرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ' کو جمع کر کے مختصر لفظوں میں ان کا حق بیان کیا جا سکتا تھا' اس انداز کو اختیار نہیں کیا گیا' بلکہ مَردوں کے حق کو جس تفصیل سے بیان کیا گیا ہے' اسی توضیح وتشریح کے ساتھ عورتوں کا حق جداگانہ بیان فرمایا گیا ہے' تاکہ دونوں کے حقوق کا مستقل اور اہم ہونا بالکل واضح ہو جائے۔

اسی لفظ اَقْرَبُوْنَ سے ایک اور بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مال وراثت کی تقسیم ضرورت کے معیار سے نہیں' بلکہ قرابت کے معیار سے ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ رشتہ داروں میں جو زیادہ غریب اور حاجت مند ہو' اُس کو زیادہ حصہ وراثت کا مستحق سمجھا جائے' بلکہ اصول یہ ہے کہ جو میت کے ساتھ رشتہ کے لحاظ سے قریب تر ہوگا' وہ بنسبت بعید والے کے زیادہ مستحق وراثت ہوگا' اگرچہ ضرورت اور حاجت بعید والے کو زیادہ ہو۔ اب اگر اقربیت کے ضابطے کو چھوڑ کر بعض رشتہ داروں کے محتاج یا نافع ہونے کو اصول بنا لیا جائے' تو نہ اس کا کوئی معیار بن سکتا ہے اور نہ ہی یہ ایک طے شدہ مستحکم قانون کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ اقربیت کے علاوہ کوئی دوسری میزان اور معیار لامحالہ وقتی اور اجتہادی ہوگا۔ فقر وحاجت کوئی دائمی حالت نہیں' انسانوں کے حالات بھی بدلتے رہتے ہیں

اوران کے درجات بھی۔ ایسی صورت میں استحقاق کے بہت سے دعوے داروں میں فیصلہ کرنا ایک مشکل مرحلہ ہی رہے گا۔

اس قرآنی اصول کو اگر سمجھ لیا جائے تو یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ‘ جسے بلاوجہ آج کل ایک نزاع کی شکل دے دی گئی ہے‘ خود بخود ایک قطعی فیصلہ کے ساتھ حل ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یتیم پوتا بنسبت دوسرے ورثاء کے‘ زیادہ ضرورت مند ہو‘ لیکن اَقْرَبُوْن کے قانون کے تحت وہ مستحق وراثت نہیں ہوسکتا‘ کیونکہ دوسرے بیٹوں یا بیٹے کی موجودگی میں وہ اَقرب کے تحت نہیں آتا!! اس کی ضرورت پوری کرنے اور کفالت کے لیے دوسرے انتظامات کیے گئے ہیں۔ ویسے بھی بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتے کو میراث نہیں ملے گی‘ خواہ اس کا باپ حیات ہو یا انتقال کر گیا ہو۔

اسی طرح آیت میں ﴿مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ﴾ فرما کر ایک دوسری جاہلانہ رسم کی اصلاح کی گئی ہے۔ بعض قوموں میں مخصوص اقسامِ مال کو بعض خاص وارثوں کے لیے علیحدہ کر لیا جاتا تھا‘ مثلاً گھوڑا‘ تلوار اور دیگر اسلحہ وغیرہ‘ یہ صرف نوجوان مردوں کا حق تھا اور دیگر وارثوں کو اس سے محروم رکھا جاتا۔ قرآن شریف کے اس حکم نے واضح کر دیا کہ میت کی ملکیت میں جو بھی چیز تھی‘ خواہ بڑی ہو یا چھوٹی اور تھوڑی ہو یا زیادہ‘ ہر ایک میں ہر وارث کا برابر کا حق ہے۔ کسی وارث کو کوئی خاص چیز بغیر تقسیم کے خود رکھ لینا یا کسی دوسرے وارث کو دے دینا قطعاً جائز نہیں۔

آیت کے آخر میں ﴿نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا﴾ فرما کر بتا دیا گیا کہ مختلف وارثوں کے جو اپنے اپنے حصے قرآن پاک نے مقرر فرمائے ہیں‘ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ حصے ہیں۔ اس میں کسی کو بھی اپنی رائے اور قیاس سے کمی بیشی یا تغیر و تبدل کرنے کا کسی صورت میں بھی کوئی حق نہیں۔ اسی لفظ مَفْرُوْضًا سے ایک اور مسئلہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وراثت کے ذریعے جو ملکیت وارثوں کی طرف منتقل ہوتی ہے‘ وہ ملکیت جبری ہے۔ اس میں نہ وارث کا قبول کرنا شرط ہے‘ نہ اس کا اس پر راضی ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ زبان سے بصراحت یہ بھی کہہ دے کہ میں اپنا حصہ نہیں لیتا‘ تب بھی وہ شرعاً اپنے حصے کا مالک ہو چکا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ مالک بن کر شرعی اصول کے مطابق کسی دوسرے کو اپنا حصہ ہبہ کر دے یا اسے بیچ ڈالے یا پھر دوسروں میں تقسیم کر دے۔ (۴)

اس آیت قرآنی میں واضح طور پر پانچ حکم دیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ میراث صرف مردوں کا ہی حصہ نہیں ہے‘ بلکہ عورتیں بھی اس کی حق دار ہیں۔ دوسرے یہ کہ میراث بہرحال تقسیم ہونی چاہیے خواہ وہ کتنی ہی کم ہو‘ حتیٰ کہ اگر مرنے والے نے ایک گز کپڑا چھوڑا ہے اور دس وارث ہیں‘ تو اسے بھی دس حصوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک وارث دوسرے وارثوں سے ان کا حصہ خرید لے۔ تیسرا یہ کہ اس آیت سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ وراثت کا قانون ہر قسم کے اَموال واَملاک پر جاری ہوگا‘ خواہ وہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ‘ زرعی ہو یا صنعتی‘ یا کسی اور صنف مال میں شمار ہوتے ہوں۔ چوتھا یہ کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حق میراث اس وقت پیدا ہوتا ہے (شروع ہوتا ہے) جب مورث کوئی مال چھوڑ کر مرا ہو۔ پانچواں یہ کہ اس سے یہ قاعدہ بھی نکلتا ہے کہ قریب تر رشتہ دار کی موجودگی میں بعید تر رشتہ دار میراث کا حق دار نہ ہوگا۔ (۵)

میراث سے محروم رہنے والوں کی دلجوئی کا حکم

اب میت کے رشتہ داروں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو ضابطہ شرعی کے تحت میراث سے حصہ نہیں مل سکتا' لیکن ظاہر ہے کہ علم الفرائض (علم میراث) کی تفصیلات کا ہر کسی کو علم نہیں ہوتا' اس لیے عموماً ہر رشتہ دار خواہش مند ہوتا ہے (اور ان میں کچھ واقعی مستحق اور یتیم بھی ہو سکتے ہیں) کہ اس کو بھی میراث سے حصہ ملے۔ وہ رشتہ دار جو شرعی ضابطہ میراث کے تحت محروم قرار دیے گئے ہیں' تقسیم میراث کے وقت' خصوصاً جبکہ وہ موقع پر موجود بھی ہوں' ان کا دل رنجیدہ اور افسردہ ہو سکتا ہے۔ اب قرآنی نظام کی خوش اسلوبی دیکھئے کہ ایک طرف تو خود قرآن کا بتایا ہوا عادلانہ ضابطہ ہے کہ اَقرب کے مقابلے میں اَبعد محروم رہے گا' دوسری طرف محروم ہونے والے اَبعد کی دل شکنی بھی گوارا نہیں ہوتی۔ اگلی آیت میں اسی حوالے سے ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۸﴾ (النساء)

''اور جب حاضر ہوں تقسیم (میراث) کے وقت (محروم وراثت) رشتہ دار' یتیم اور محتاج' تو ان کو بھی اس مال میں سے کچھ دے دو اور کہو ان سے اچھی (معقول) بات۔''

یعنی جو دُور کے رشتہ دار اور یتیم' مسکین میراث میں حصہ پانے سے محروم ہو رہے ہوں' تو میراث پانے والوں کا اخلاقی فرض ہے کہ اس مال میں سے باختیارِ خود کچھ حصہ ان کو بھی دے دیں۔ یہ دینے والوں کے لیے ایک قسم کا صدقہ اور موجب ثواب ہے' لہٰذا اس میں کسی قسم کی تنگ دلی محسوس نہ کریں۔

اس حقیقت کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم اور سفارش بھی ہے' ٹالنے والے کو نتیجہ بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔ ایسے وقت میں جبکہ مال و دولت بغیر سعی و عمل کے محض حکمِ خداوندی سے شرعی ورثاء کو مل رہا ہو' تو انفاق فی سبیل اللہ کا داعیہ اور وسعت بھی دل میں پیدا ہونی چاہیے۔ اسی کی ایک نظیر اس آیت میں بھی ہے:

﴿کُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ (الانعام:۱۴۲)

''اپنے باغ کا پھل کھاؤ جبکہ وہ پھل دینے لگے' اور جس روز پھل کاٹو (توڑو) تو اس کا حق (نکال کر فقراء و مساکین کو دے) دو۔''

اسی ضمن میں متوفی کا محروم الارث پوتا یا پوتی بھی آ جاتی ہے۔ اس کے چچاؤں اور پھوپھیوں کا کفالت کے حوالے سے اخلاقی فرض بنتا ہے کہ اس کو اپنے حصے میں سے بخوشی کچھ دے دیں اور اس کا دل ہرگز نہ توڑیں۔

اب اگر یہ (جمع ہونے والے) لوگ تھوڑے مال پر راضی نہ ہوں اور برابر حصے کا مطالبہ کرنے لگیں' تو معقول طور پر ان کو دلنشین طریقے سے سمجھا دیا جائے کہ شرعی لحاظ سے تمہارا باقاعدہ حصہ نہیں بنتا اور ہم نے اخلاقاً تمہیں کچھ دیا ہے۔ اس موقع پر کوئی ایسی بات انہیں بالکل نہ کہی جائے جو ناگواری اور دل شکنی کا باعث بنے۔ یہاں ایک ضابطہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ شرعاً دیا جانے والا مال حاضر بالغ ورثاء ہی اپنے حصے سے دے سکتے

ہیں‘ نابالغ اور غائب کے حصے سے کچھ دینا درست نہیں ہے۔ (۶)

قِسْمَة سے مراد میراث کی تقسیم ہے‘ یعنی تقسیم کے وقت ان کے قریبی وارث رشتہ داروں کے علاوہ دور کے دوسرے رشتہ دار آ جائیں تو ترکہ یا میراث میں سے بطور صدقہ انہیں کچھ دے دو۔ حضرت حسن بصریؒ نے کہا کہ وہ اس (میت) کا تابوت‘ برتن‘ بوسیدہ کپڑے‘ استعمال کا سامان اور وہ چیز جس کی تقسیم سے وہ حیا محسوس کرتے‘ وہ ان (رشتہ داروں) کو دے دیتے۔ سعید بن جبیر اور ضحاک نے کہا کہ یہ آیت ’یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ‘ کی آیت سے منسوخ ہے۔ ایسا کہنے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی۔ البتہ ایک اخلاقی فرض اور استحبابی حکم ہونے پر اکثر کا اتفاق ہے۔ حضرات ابن عباسؓ‘ عبداللہؓ بن مسعود‘ شعبی‘ نخعی‘ زہری‘ مجاہد‘ ابن سیرین اور ایک جماعت نے کہا کہ یہ محکم ہے۔ قتادہ نے یحییٰ بن یعمر سے نقل کیا ہے کہ تین آیتیں محکم ہیں‘ مدنی ہیں‘ جنہیں لوگوں نے چھوڑ رکھا ہے۔ یہ (مذکورہ بالا) آیت‘ آیت استیذان ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِیْنَ مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ﴾ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى﴾۔ ایک قول یہ بتایا گیا ہے کہ امر وجوب کے لیے ہے‘ یہ ایسا حق ہے جو چھوٹے بڑے سب لوگوں کے حق میں واجب ہے۔ اگر وارث بڑے ہوں تو وہ اپنے حصے کے خود والی بنیں گے اور اگر چھوٹے ہوں تو ان کے ولی کو دے دیا جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اگر وارث بڑے ہوں تو وہ ان لوگوں (دُور کے رشتہ داروں) کو کچھ دیں‘ جو دیں اسے قلیل جانیں اور ان پر کسی قسم کا احسان نہ جتلائیں۔ اگر وارث چھوٹے ہوں تو ان کا ولی یا وصی معذرت کر دے کہ میں اس مال کا مالک نہیں ہوں‘ یہ ان چھوٹے بچوں کا ہے‘ اگر یہ میرا مال ہوتا تو میں تمہیں ضرور کچھ دیتا‘ جب یہ خود بڑے ہوں گے تو (امید ہے) تمہارے حقوق پہچانیں گے۔ ارشادِ خداوندی: ﴿وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا﴾ کا یہی معنی ہے۔ (۷)

وہ یتیم پوتے اور نواسے جن کے والدین ان کے دادا یا نانا کی زندگی میں وفات پا جاتے ہیں‘ ان کے حصے کے حوالے سے ایک لائحہ عمل سید مودودی نے سورۃ البقرۃ کی درج ذیل آیت کی روشنی میں پیش کیا ہے:

﴿كُتِبَ عَلَیْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَیْرَا ۖ الْوَصِیَّةُ لِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِیْنَ﴾

”تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے معروف طریقے سے وصیت کرے‘ یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔“

یہ حکم اس زمانے میں دیا گیا تھا جبکہ وراثت کی تقسیم کے لیے ابھی کوئی قانون مقرر نہیں ہوا تھا۔ اس وقت ہر شخص پر لازم تھا کہ وہ اپنے وارثوں کے حصے بذریعہ وصیت مقرر کر جائے‘ تاکہ اس کے مرنے کے بعد نہ تو خاندان میں جھگڑے پیدا ہوں اور نہ کسی حق دار کی حق تلفی ہونے پائے۔ بعد میں جب تقسیم وراثت کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود ایک ضابطہ بنا دیا‘ تو نبی اکرم ﷺ نے احکامِ وصیت اور احکامِ میراث کی توضیح میں حسب ذیل دو قاعدے بیان فرمائے:

ایک یہ کہ اب کوئی شخص کسی وارث کے حق میں وصیت نہیں کرسکتا‘ یعنی جن رشتہ داروں کے حصے قرآن میں مقرر کر دیے گئے ہیں‘ ان کے حصوں میں نہ تو وصیت کے ذریعے سے کوئی کمی بیشی کی جاسکتی ہے‘ نہ کسی وارث کو میراث سے محروم کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی وارث کو اس کے قانونی حصے کے علاوہ کوئی چیز بذریعہ وصیت دی جاسکتی ہے۔

دوسرے یہ کہ وصیت بھی کل جائیداد کے صرف ایک تہائی حصے کی حد تک کی جاسکتی ہے۔

ان دو تشریحی ہدایات کے بعد اب اس آیت کا منشا یہ قرار پاتا ہے کہ آدمی اپنا کم از کم دو تہائی مال تو اس لیے چھوڑ دے کہ اس کے مرنے کے بعد وہ حسب قاعدہ اس کے وارثوں میں تقسیم ہو جائے اور زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال کی حد تک اسے اپنے اُن غیر وارث رشتہ داروں کے حق میں وصیت کرنی چاہیے جو اس کے اپنے گھر میں یا اس کے خاندان میں مدد کے مستحق ہوں‘ یا جنہیں وہ خاندان کے باہر محتاجِ اعانت پاتا ہو‘ یا رفاہِ عام کے کاموں میں سے جس کی بھی وہ مدد کرنا چاہے۔ بعد کے لوگوں نے وصیت کے اس حکم کو محض ایک سفارشی حکم قرار دے دیا‘ یہاں تک کہ بالعموم وصیت کا طریقہ منسوخ ہی ہو کر رہ گیا۔ لیکن قرآن مجید میں اسے ایک حق قرار دیا گیا ہے‘ جو خدا کی طرف سے متقی لوگوں پر عائد ہوتا ہے۔ اگر اس حق کو ادا کرنا شروع کر دیا جائے‘ تو بہت سے وہ سوالات خود ہی حل ہو جائیں‘ جو میراث کے بارے میں لوگوں کو الجھن میں ڈالتے ہیں۔ مثلاً ان پوتوں اور نواسوں کا معاملہ جن کے ماں باپ نانا کی زندگی میں مر جاتے ہیں۔ (۸)

یہاں خیال رہے کہ ایک تہائی کی حد زیادہ سے زیادہ کے لیے ہے‘ وصیت اس سے کم میں بھی کی جاسکتی ہے۔ موجودہ حالات و واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے محروم الارث پوتے کے حصے کو اس طریقے سے محفوظ کرنے کے لیے اسلامی دائرے کے اندر توسع کے اصول کو لاگو کر کے ضروری قانون سازی بھی کی جانی چاہیے۔

اولاد کو تونگر چھوڑنا‘ فقیر چھوڑنے سے بہتر ہے

اگلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝﴾

’’(اور سوچیں کہ) اگر چھوڑ جاتے وہ اپنے پیچھے چھوٹے چھوٹے کمزور بچے‘ تو وہ (خود) کتنے فکرمند ہوتے ان کے متعلق‘ پس چاہیے کہ وہ ڈریں اللہ سے اور کہیں ایسی بات جو بالکل درست ہو۔‘‘

اس میں تمام مسلمانوں کو خطاب عام ہے کہ اس بات کا پورا پورا اہتمام کریں کہ مرنے والے کا ترکہ اس کی اولاد کو پورا پورا پہنچ جائے اور ہر ایسے طریقے اور حیلے سے پرہیز کریں جس سے اولاد کے حصے پر کوئی غلط اور ناگوار اثر پڑتا ہو۔ اس کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ آپ کسی مسلمان کو کوئی ایسی وصیت یا تصرف کرتے ہوئے دیکھیں جس سے اس کی اولاد اور دوسرے وارثوں کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے‘ تو آپ پر لازم ہے کہ اس شخص کو ایسی وصیت یا تصرف سے روکیں۔ صحیحین میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی بیماری

کے دوران ان کی عیادت کو گئے۔ حضرت سعدؓ نے عرض کیا کہ میرے پاس مال بہت ہے اور صرف میری ایک لڑکی ہی پیچھے ہے' اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنا دو تہائی مال خدا کی راہ میں صدقہ کر دوں؟ آپؐ نے فرمایا: ''نہیں''۔ میں نے عرض کیا کہ نصف؟ آپؐ نے فرمایا: 'نہیں''۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''تہائی (مال صدقہ کر سکتے ہو) لیکن ہے یہ بھی زیادہ۔ تو اگر اپنے پیچھے اپنے وارثوں کو تونگر چھوڑ کر جائے یہ اس سے بہتر ہے کہ انہیں فقیر چھوڑ کر جائے کہ وہ (دوسروں کے سامنے) ہاتھ پھیلاتے پھریں''۔ تفسیر ابن کثیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ لوگ ایک تہائی سے بھی کم یعنی چوتھائی کی وصیت کریں تو اچھا ہے' اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے تہائی کو بھی زیادہ فرمایا ہے۔ پورا یا آدھا مال صدقہ کر دیا جائے تو وارثوں کا حصہ ختم یا بالکل کم ہو جاتا ہے۔

اس آیت کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ یتیم بچوں کے اولیاء (سرپرست) ان کے مال کی حفاظت اور پھر بالغ ہونے کے بعد ان کو پورا پورا مال دینے کا بڑا اہتمام کریں اور اس میں ادنیٰ سی کوتاہی بھی روا نہ رکھی جائے۔ دوسروں کے یتیم بچوں کے حالات کو اپنے بچوں اور اپنی محبت کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھیں۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بعد ان کی اولاد سے لوگ اچھا معاملہ اور برتاؤ کریں اور انہیں پریشانی نہ ہو' کوئی ان پر کسی قسم کا بھی ظلم نہ کرے' تو پھر ان سرپرستوں کو بھی چاہیے کہ وہ دوسرے کی اولادِ یتامیٰ کے ساتھ بھی بالکل اسی قسم کا معاملہ کریں اور ہر قسم کی زیادتی سے بچیں۔ (۹)

آیت کا مطلب یہ ہے کہ قوی وارث عورتوں اور کمزوروں کا حصہ دیں اور غیر وارثوں جیسے محتاج' فقراء اور مساکین کو کچھ صدقہ کر دیں اور ان ضعفاء کے ضائع ہونے سے ڈریں' جس طرح اگر وہ بھی اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑ جاتے تو اس کے ضائع ہونے کا انہیں خوف ہوتا۔ انہیں ان بچوں پر اسی طرح شفقت کرنی چاہیے جس طرح وہ اپنی اولادوں پر شفیق ہیں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ کمزور وارثوں کو ضائع کرنے میں اللہ سے ڈریں۔ گویا یہاں لفظ اللہ میں تنازع فعلین ہے' ایک فعل لیخش اور دوسرا لیتقوا۔ لفظ اللہ میں اہل بصرہ کے مطابق (یہاں) دوسرا فعل عمل کر رہا ہے اور پہلے فعل کا مفعول حذف ہے۔ اگر پہلا فعل عامل ہوتا تو کلام یوں ہوتا: فَالْيَتَّقُوْهُ کہ انہیں تقویٰ کا حکم دیا جو کہ خشیت کی انتہا ہے' جبکہ پہلے انہیں خشیت کا حکم دیا گیا' مقصود مبدأ اور منتہیٰ کی رعایت ہے۔

آیت میں 'قول سدید' کے ضمن میں وارثوں کے لیے امر (حکم) ہے کہ وہ جو غیر وارث قریبی رشتہ دار' یتیم اور مساکین ترکہ (میراث) کی تقسیم کے وقت حاضر ہو جائیں' ان پر شفقت کریں' یہ تصور کرتے ہوئے کہ اگر یہ ان کی اولاد ہوتی اور ان کے پیچھے (بعد میں) کمزور رہ جاتی' تو کیا انہیں محروم رکھنے کو وہ جائز اور درست سمجھتے؟ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ (حکم) اس آدمی کے بارے میں ہے' جس کے فوت ہونے کا وقت قریب ہو اور اس کے پاس بیٹھنے والے اسے یوں کہیں کہ تیری اولاد اور وارث تیرے کچھ کام نہ آئیں گے' اپنے غلام آزاد کر دے اور فلاں فلاں کو اتنا اتنا دے دے' یہاں تک کہ تمام مال و متاع خرچ کر دے۔ یہاں اس مریض اور قریب الموت کے پاس حاضر لوگوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ اللہ سے ڈریں یا مرنے والے کی اولاد کے بارے میں

ڈریں‘ وہ اس کی اولاد پر بھی اسی طرح شفقت کریں‘ جس طرح کہ وہ اپنی اولاد کے بارے میں شفقت کرتے ہیں۔ اس مرنے والے شخص کو اس حال میں نہ چھوڑیں کہ وہ اپنی اولاد کو نقصان پہنچائے اور انہیں وراثت میں کوئی مال نہ دے‘ یا پھر وصیت کرنے والوں کو حکم ہے کہ وہ کمزور وارثوں کی طرف نظر کریں‘ جن کے (حقوق) ضائع ہونے کا خوف ہے۔ اسی طرح وہ وصیت میں اسراف سے کام نہ لیں اور ثلث مال سے زیادہ کی وصیت بالکل نہ کریں‘ تاکہ (ان کے اپنے) وارث محروم نہ رہ جائیں۔ لَوْ کا جواب خَافُوْا ہے۔

قوی وارث کمزور وارثوں سے شفقت اور حسنِ ادب سے بات کریں‘ یا اولیاء یتیموں پر شفقت کرتے ہوئے اچھی طرح بھلے طریقے سے بات کریں‘ جس طرح سے وہ اپنی اولادوں سے کرتے ہیں‘ یا وصیت کے وقت جو لوگ حاضر ہوں‘ وہ موصی (وصیت کرنے والے) کو اپنے مال کے تیسرے حصے سے کم وصیت کرنے کی بات کہیں۔ تقسیم کے وقت جمع ہونے والے فقراء اور مساکین سے بھی اچھی طرح پیش آئیں‘ یا وصیت کرنے والا اپنی وصیت میں اچھی بات کرے اور تیسرے حصے سے کم میں وصیت کر دے‘ اور وصیت میں حسن نیت کی رعایت کرتے ہوئے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کا بھی طالب ہو۔ تفسیر ابن کثیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ کاش! لوگ (وصیت میں) تہائی سے ہٹ کر چوتھائی پر آ جائیں‘ اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تہائی کی رخصت دیتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ تہائی (بھی) بہت ہے۔ (۱۰)

یتیم کا مال جہنم کی آگ ہے!

اس سے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ۝۱۰﴾

”بے شک لوگ جو کھاتے ہیں یتیموں کے مال ظلم کرتے ہوئے‘ وہ تو بس کھا رہے ہیں اپنے پیٹوں میں آگ‘ اور عنقریب جھونکے جائیں گے بھڑکتی (ہوئی) آگ میں۔“

اس آیت مبارکہ میں یتیم کے مال کو جہنم کی آگ قرار دیا گیا ہے۔ یہ یتیم کے مال میں ناجائز تصرف کرنے والوں کے لیے شدید ترین وعید ہے۔ بہت سے مفسرین نے اسے تشبیہ اور کنایہ پر محمول کیا ہے۔ گویا یتیموں کا مال ناحق کھانے والا ایسا ہے جیسے کوئی اپنے پیٹ میں آگ بھرے‘ کیونکہ ایسے شخص کا انجام بالآخر قیامت میں ایسا ہی ہونے والا ہے۔ مگر اہلِ تحقیق کا قول ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں کوئی مجاز اور کنایہ نہیں‘ بلکہ جو یتیم کا مال ناجائز طریقے سے کھایا جائے وہ حقیقت میں آگ ہی ہے‘ اگرچہ اس وقت اس کی صورت آگ کی نہ معلوم ہوتی ہو‘ جیسے کوئی شخص دیا سلائی کو کہے کہ یہ آگ ہے یا سنکھیا کو کہے کہ یہ قاتل ہے‘ اب ظاہر ہے کہ دیا سلائی کو ہاتھ میں لینے سے ہاتھ نہیں جلتا اور سنکھیا کو ہاتھ میں لینے بلکہ منہ میں رکھنے سے بھی کوئی آدمی نہیں مرتا‘ البتہ ذرا سی رگڑ

کھانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جس نے دیا سلائی کو آگ کہا' وہ صحیح کہا تھا' اسی طرح حلق سے نیچے اترنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ سنکھیا کو قاتل کہنے والا بھی اپنے قول میں سچا تھا۔قرآن مجید کے عام اطلاقات سے بھی اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے کہ انسان جو بھی عمل نیک یا بد کر رہا ہے' یہی عمل جنت کے درخت اور پھل پھول ہیں یا (پھر) جہنم کے دہکتے ہوئے انگارے ہیں' اگرچہ ان کی صورت یہاں مختلف ہے' مگر قیامت کے روز اپنی اصلی شکلوں میں متشکل ہو کر سامنے آئیں گے۔قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا﴾ (الکھف:۴۹) ''اور قیامت کے روز وہ اپنے کیے ہوئے اعمال کو موجود پائیں گے''۔یعنی جو ثواب اور عذاب ان کو نظر آئے گا' وہ حقیقت میں ان کا اپنا ہی عمل ہوگا۔بعض روایات میں ہے کہ یتیم کا مال ناحق کھانے والا قیامت کے روز اس حالت میں اٹھایا جائے گا کہ اس (کے پیٹ) کے اندر سے آگ کی لپٹیں اس کے منہ' ناک' کانوں اور آنکھوں سے نکل رہی ہوں گی۔صحیحین میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''سات گناہوں سے بچو' جو ہلاکت کا باعث ہیں''۔عرض کیا گیا: وہ کون سے ہیں؟ تو حضور ﷺ نے جواب میں ان میں سے ایک ''مال یتیم کا کھا جانا'' بھی بتایا۔ابن ابی حاتم میں ہے کہ صحابہؓ نے حضور ﷺ سے معراج کی رات کا واقعہ پوچھا تو اس میں آپؐ نے (یہ بھی) فرمایا کہ میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ ان کے ہونٹ نیچے لٹک رہے ہیں اور فرشتے انہیں گھسیٹ کر ان کا منہ خوب کھول دیتے ہیں' پھر جہنم کے گرم پتھر ان میں ٹھونس دیتے ہیں' جو ان کے پیٹ میں سے پیچھے کے راستے سے نکل جاتے ہیں' اور وہ بری طرح چیخ چلا رہے ہیں اور ہائے وائے مچا رہے ہیں۔میں نے حضرت جبرائیلؑ سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا کہ یتیموں کا مال کھا جانے والے ہیں' جو اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں اور عنقریب جہنم میں جائیں گے۔(۱۱)

گویا آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ یتیم کا مال جو ناحق کھایا جائے وہ درحقیقت جہنم کی آگ ہوگی' گو اس وقت اس کا آگ ہونا محسوس نہ ہو۔اسی لیے حضور پاک ﷺ نے اس معاملے میں شدید احتیاط کی ہدایات دی ہیں۔حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُحَرِّجُ حَقَّ الضَّعِیْفَیْنِ الْمَرْاَۃِ وَالْیَتِیْمِ))(۱۲) ''اے اللہ! میں دو کمزوروں کا حق (مال) حرام کرتا ہوں: ایک عورت اور دوسرے یتیم۔''

آیت میں لفظ 'یَاْکُلُوْنَ' استعمال ہوا ہے اور یتیم کا مال کھانے پر شدید وعید سنائی گئی ہے' لیکن یتیم کے مال کا ہر طرح سے استعمال' کھانے پینے میں ہو یا (چیز) برتنے میں' سب حرام اور باعث عذاب وعتاب ہے' کیونکہ محاورے میں کسی کا مال ناحق کھا لینا ہر طرح کے استعمال کو شامل ہوتا ہے۔

جب کوئی شخص انتقال کر جاتا ہے تو اس کے مال کے ہر ہر حصے اور ہر چھوٹی بڑی چیز کے ساتھ ہر وارث کا حق جڑ جاتا ہے۔اس کے نابالغ بچے یتیم ہو جاتے ہیں' ان بچوں کے ساتھ عمومی طور پر ہر گھر میں ظلم وزیادتی والا معاملہ ہوتا ہے۔ہر وہ شخص جو ان بچوں کے باپ کی وفات کے بعد اس کے مال پر قابض ہوتا ہے' خواہ ان بچوں کا چچا ہو' تایا ہو یا بڑا بھائی ہو یا والدہ ہو یا کوئی اور ولی یا وصی ہو' وہ اکثر ان امور کے مرتکب ہو جاتے ہیں' جن کی

ممانعت مندرجہ بالا آیات میں کی گئی ہے۔ اول تو سالہا سال مال میراث کو تقسیم کرتے ہی نہیں۔ بس ان بچوں کے روٹی کپڑے پر تھوڑا بہت خرچ کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح بدعات' رسومات اور فضولیات پر اسی مال مشترک سے خرچ کیے جاتے ہیں۔ اپنی ذات پر بھی خرچ کرتے ہیں اور سرکاری کاغذات میں نام بدلوا کر اپنے بچوں کا نام لکھواتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ اللہ کی پکڑ سے وہ کیسے بچ سکیں گے۔

اس ضمن میں یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ مدرسوں اور یتیم خانوں میں جو مال اور چندہ یتیموں کے لیے آتا ہے' اس کو یتیموں پر خرچ نہ کرنا بھی یتیم کا مال ناحق کھانے اور ہضم کرنے کی ایک صورت ہے' ایسی صورت میں یہ وعیدیں اہل مدارس کو بھی ہر دم یاد رہنی چاہئیں۔ (۱۳)

آیت میں ظُلْمًا یا تو مفعولِ مطلق ہے اور تقدیر کلام یوں ہے: اَکْلًا ظُلْمًا یا یہ حال ہے اور تقدیر کلام ہے: ظَالِمِیْنَ' یعنی ایسی چیز کھاتے ہیں جو انہیں دوزخ کی طرف لے جائے گی۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے شب معراج میں ایک ایسی قوم دیکھی جن کے ہونٹ اونٹ کے ہونٹوں کی طرح تھے' ان میں سے اوپر والا نتھنوں کے ساتھ سمٹا ہوا تھا اور دوسرا پیٹ پر لٹکا ہوا تھا' اور جہنم کے داروغے جہنم کے انگارے اور پتھر ان کے منہ میں ڈال رہے تھے۔ میں نے پوچھا: جبرائیل یہ کون لوگ ہیں؟ جبرائیل نے کہا: یارسول اللہ! یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں کا مال ظلم کرتے ہوئے کھاتے ہیں''۔ (۱۴) اسی طرح حضرت ابو بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن ایک قوم اپنی قبروں سے اس طرح اٹھائی جائے گی کہ ان کے منہ سے آگ کے شعلے نکل رہے ہوں گے''۔ پوچھا گیا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا.....الخ﴾ (۱۵)

جمہور علماء نے یَصْلَوْنَ کو یاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے' یعنی وہ اس میں داخل ہوں گے۔ ابن عاصم اور ابوبکر نے یاء کے ضمہ کے ساتھ (یُصْلَوْنَ) پڑھا ہے' یعنی انہیں جہنم میں داخل کیا جائے گا اور انہیں جلایا جائے گا۔ سَعِیْر فعیل کا وزن ہے جو مفعول کے معنی میں ہے۔ یہ سعرت النار سے مشتق ہے' یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو اسے (آگ کو) روشن کردے۔ (۱۶)

ورثاء کا تعین اللہ کی طرف سے ہے

سَیَصْلَوْنَ: صلی مصدر کے معنی ہے: گوشت کو بھوننا' ہاتھ کو آگ سے تاپنا۔ اِصْلاء اور تَصْلِیَۃ کا معنی ہے جلانا' بھسم کر ڈالنا۔ سَعِیْرًا: مشتعل آگ یا بھڑکتی ہوئی آگ۔

اسی طرح ترکہ (وراثت) کے حوالے سے سورۃ النساء ہی میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝۳۳﴾

''اور ماں باپ اور قرابت دار جو ترکہ (وراثت) چھوڑیں' اس کے وارث (ہر شخص کے لیے) ہم

نے مقرر کر دیے ہیں اور جن سے تمہارا معاہدہ ہوا ہو' ان کو ان کا حصہ دے دو' بے شک ہر چیز اللہ کے روبرو ہے۔''

یہاں 'کُل' کا مضاف الیہ محذوف ہے اور جار مجرور مابعد کے متعلق ہے۔ یعنی ہم نے ہر مال اور میت کے وارث بنا دیے ہیں' جو مال کی حفاظت کرتے اور میت کے وارث بنتے ہیں۔ ''مما ترك'' جار مجرور ظرف مستقر ہے' یعنی محذوف شبہ فعل کے متعلق ہے اور پھر مال کی صفت ہے۔

'اَلْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ' یہ ترک فعل کا فاعل ہے۔

یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ 'لِكُلٍّ' خبر ہو اور ''جَعَلْنَا مَوَالِيَ' صفت ہو۔ صفت میں ضمیر عائد محذوف ہے' اور اللہ تعالیٰ کا فرمان 'مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ' یہ مبتدا محذوف کی صفت ہو۔ گویا تقدیر کلام یوں ہو گی: لِكُلِّ جَمَاعَةٍ مِّنْ وَرَثَةٍ جَعَلْنَا

وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ ، یہاں اَلَّذِينَ کا عطف 'الوَلدان و الاقربُون' پر ہے۔

فَاٰتُوهُم نَصِيبَهُم' یہ سابقہ جملہ کا بیان ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اسم موصول مبتدا ہو' جو اپنے ضمن میں شرط کا معنی لیے ہوئے ہے اور 'فاٰتوھم' اس کی خبر ہو۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اسم موصول فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہو' جس کا مابعد اس کی تفسیر بیان کر رہا ہے' جیسے اس مثال میں ہے: زَيْدًا فَاضْرِبْهُ وغیرہ۔ اَقْرَبُوْنَ پر وقف کا رسول اللہ ﷺ سے منقول نہ ہونے کی وجہ سے کوئی اعتبار نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مولیٰ اعلیٰ (جس کی پناہ لی گئی اور جس کے ساتھ معاہدہ کیا گیا ہو) تمام ترکہ یا جو باقی بچے' اس کا وارث ہوتا' جبکہ مولیٰ اسفل (جو باہر سے آ کر کسی سے معاہدہ کرے اور اس کی پناہ لے) وارث نہیں ہوتا۔ یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب میاں بیوی کو ان کا حصہ دے دیا جائے اور میت کا نہ کوئی عصبہ' نسبی صاحب فرض اور نہ ہی کوئی ذی رحم محرم ہوتا ہے' ان سب میں سے کوئی ایک بھی پایا جائے تو بالاجماع مولیٰ کی کوئی میراث نہیں ہوتی۔ جمہور علماء کے نزدیک یہ حکم دورِ جاہلیت اور ابتدائے اسلام میں تھا اور حلیف کا چھٹا حصہ تھا۔ پھر یہ حکم سورۃ الاحزاب کی درج ذیل آیت سے منسوخ ہو گیا:

﴿وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ۭ﴾ (آیت ۶)

''اور رشتہ دار کتاب اللہ کی رو سے بہ نسبت دوسرے مومنوں اور مہاجروں کے آپس میں زیادہ حق دار ہیں' (ہاں) مگر یہ کہ تم اپنے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہو۔''

جمہور کے نزدیک موالات کی صورت میں مولیٰ کسی چیز کا وارث نہیں ہو گا' بلکہ کوئی بھی وارث نہ ہونے کی صورت میں ترکہ بیت المال میں جائے گا۔ آیت کا آخری حصہ اس امر میں صریح ہے کہ موالی کے حق میں وصیت ضروری ہے اور اس کے بغیر ان کے لیے کچھ بھی نہیں بنتا۔

آخر میں ورثاء کا حصہ روکنے پر تنبیہ کی جا رہی ہے۔ (۱۷)

علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے عصبہ بنا دیے ہیں جو اس مال کے وارث ہوں گے جسے ان کے ماں باپ اور قرابت دار مرتے ہوئے چھوڑ جائیں۔ اور باہمی تعلقات کی بنا پر جو تمہارے منہ بولے بھائی ہیں' انہیں ان کی میراث کا حصہ دو' جیسے کہ قسموں کے ساتھ تمہارے درمیان عہد و پیمان ہو چکا تھا' لیکن بعد میں حکم آیا کہ باہمی عہد و پیمان کو تو ضرور نبھایا جائے' لیکن میراث اب انہیں نہیں مل سکتی۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ موالی سے مراد وارث ہیں' اور بعد کے جملے سے مراد یہ ہے کہ مہاجرین کی جب مدینہ آمد ہوئی تو مواخات کے بعد یہ دستور بنا کہ ہر مہاجر اپنے انصاری بھائی کا وارث ہوتا' اس (انصاری) کے ذوِرحم رشتہ دار وارث نہ ہوتے۔ اس آیت نے اس طریقے کو منسوخ قرار دیا اور حکم ہوا کہ ان کی مدد کرو' فائدہ پہنچاؤ اور ان کی خیر خواہی کرو' لیکن اب میراث انہیں نہیں ملے گی' ہاں اگر ضرورت ہے تو پھر ان کے لیے وصیت کر جاؤ۔ قبل از اسلام یہ دستور بھی تھا کہ دو شخصوں میں عہد و پیمان ہو جاتا کہ میں تیرا وارث اور تو میرا وارث ہوگا۔ اسی طرز پر قبائل عرب بھی باہمی معاہدہ کر لیتے تھے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہوا کہ جاہلیت کی قسمیں اور عہد و پیمان کو اسلام مضبوط کرتا ہے' لیکن اب اسلام میں قسمیں اور اس قسم کے عہد و پیمان کو اس آیت نے منسوخ کر دیا ہے۔ ایک اور فرمانِ نبویؐ ہے کہ ذی رحم رشتہ دار کتاب اللہ کے حکم سے زیادہ اولیٰ ہیں' بہ نسبت معاہدہ کرنے والوں کے۔

امام مالکؒ' امام شافعیؒ اور مشہور قول کی بنا پر امام احمدؒ اور جمہور کا یہی موقف ہے کہ ہر شخص کے وارث اس کے قریبی اعزہ ہیں' اور (دوسرا) کوئی نہیں۔ صحیحین میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حصہ دار وارثوں کو ان کے حصوں کے مطابق دے کر پھر جو بچ رہے' وہ عصبہ کو ملے' اور وارث وہ ہیں جن کا ذکر فرائض (میراث) کی دو آیتوں میں ہے' اور جن سے تم نے مضبوط عہد و پیمان اور قسم لی ہے' یعنی اس (مذکورہ بالا) آیت کے نازل ہونے سے پہلے' انہیں ان کا حصہ میراث دو' اور اس کے بعد جو معاہدہ ہوا' اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا (یعنی میراث نہیں ملے گی) اور بقول حضرت عبداللہ بن عباسؓ' ان (حلیفوں) کا حصہ' نصرت' امداد' خیر خواہی اور وصیت ہے' میراث نہیں۔ آپؓ کے ارشاد کے مطابق لوگ باہمی عہد و پیمان کر لیا کرتے تھے کہ ان میں سے جو پہلے مرے گا' دوسرا اس کا وارث بنے گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے 'وَاُولُوا الْاَرْحَامِ' والی آیت نازل فرما کر حکم دیا کہ ذی رحم محرم ایک سے ایک اولیٰ ہیں' ہاں اپنے حلیفوں اور دوستوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرو' یعنی اگر ان کے لیے ثُلث (یا کم) مال میں وصیت کر جاؤ تو جائز ہے' یہی مشہور و معروف ہے۔ ابن المسیبؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے حق میں اتری جو اپنے بیٹوں کے سوا دوسروں (اوروں) کو اپنا (منہ بولا) بیٹا بناتے تھے اور انہیں اپنی جائیداد کا جائز وارث قرار دیتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کا حصہ وصیت میں سے دینے کو فرمایا' اور میراث کو ذی رحم محرم رشتہ داروں اور عصبہ کی طرف لوٹا دیا اور اسے ناپسند فرمایا کہ اپنے بنائے ہوئے (منہ بولے) بیٹوں کو وراثت دی جائے۔ ابن جریرؒ کا کہنا ہے کہ میرے نزدیک مختار قول یہ ہے کہ انہیں حصہ دو یعنی نصرت' نصیحت اور معونت کا' یہ نہیں کہ انہیں ان کے ورثہ

کا حصہ دو۔ یہ معنیٰ کرنے سے آیت کو منسوخ بتانے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی' نہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ حکم پہلے تھا' اب نہیں رہا۔ بلکہ آیت کی دلالت صرف اس امر پر ہے کہ جو عہد و پیمان آپس کی امداد و اعانت' خیر خواہی اور بھلائی کے ہوتے ہیں' انہیں پورا کرو۔ (۱۸)

موالی' مولیٰ کی جمع ہے' مولیٰ کے معانی دوست' آزاد کردہ غلام' چچازاد' پڑوسی (اور وارث) وغیرہ کے ہیں' لیکن یہاں اس سے مراد ورثاء ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر مرد' عورت جو کچھ چھوڑ جائیں گے' اس کے وارث اور ماں باپ اور دیگر قریبی رشتہ دار ہوں گے۔ اس آیت کے محکم یا منسوخ ہونے کے بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ ابن جریر طبری وغیرہ اسے غیر منسوخ (محکم) مانتے ہیں اور 'اَیْمَانُکُم' سے مراد وہ حلف اور معاہدہ لیتے ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کے لیے اسلام سے قبل دو اشخاص یا دو قبیلوں کے درمیان ہوا اور اسلام کے بعد بھی وہ جاری رہے۔ 'نصیبھم' (حصہ) سے مراد اسی حلف اور معاہدے کی پابندی کے مطابق تعاون و تناصر کا حصہ ہے۔ ابن کثیرؒ اور دیگر کے نزدیک یہ آیت منسوخ ہے' کیونکہ ''اَیْمَانُکُم'' سے ان کے نزدیک وہ معاہدہ ہے جو ہجرت کے بعد ایک انصاری اور مہاجر کے درمیان اخوت کی صورت میں ہوا تھا۔ اس میں رشتہ داروں کی بجائے ایک مہاجر' انصاری کا وارث ہوتا تھا۔ چونکہ یہ ایک عارضی انتظام تھا' اس لیے پھر سورۃ الاحزاب کی ﴿وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ﴾ والی آیت نے اسے منسوخ کر دیا گیا۔ اب ﴿فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ﴾ سے مراد دوستی اور محبت' ایک دوسرے کی مدد اور بطور وصیت کچھ دے دینا بھی ہے۔ موالاتِ عقد' موالاتِ حلف یا موالاتِ اخوت میں اب وراثت کا تصور نہیں ہوگا۔ اہل علم کے ایک گروہ نے اس سے مراد ایسے دو شخصوں کو لیا جن میں سے کم از کم ایک لاوارث ہے' وہ ایک دوسرے شخص سے یہ طے کرتا ہے کہ میں تمہارا مولیٰ ہوں' اگر کوئی جنایت کروں تو میری مدد کرنا اور اگر مارا جاؤں تو میری دیت لے لینا۔ اس لاوارث کی وفات کے بعد اس کا مال مذکورہ شخص لے گا' بشرطیکہ واقعتاً اس کا کوئی وارث نہ ہو۔ بعض دوسرے علماء نے ایک اور معنیٰ اس آیت کا بیان کیا ہے' ان کے نزدیک ﴿وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ سے مراد بیوی اور شوہر ہیں اور اس کا عطف 'الاقربون' پر ہے' یعنی کہ ماں باپ نے' قرابت داروں نے اور جن کو تمہارا عہد و پیمان آپس میں باندھ چکا ہے (یعنی شوہر یا بیوی) انہوں نے جو کچھ چھوڑا' اس کے حق دار یعنی حصہ دار ہم نے مقرر کر دیے ہیں' لہٰذا (مذکورہ بالا) ان حق داروں کو ان کے حصے دو (اس تفسیر سے آیت کو منسوخ ماننے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی ہے۔) گویا سورۃ النساء کی شروع کی آیات میراث میں تفصیلاً جو حصے بیان کیے گئے تھے' یہاں اجمالاً ان کی ادائیگی کی تاکید مزید کی گئی ہے۔ (۱۹)

مولیٰ کی جمع موالی ہے اور اس کے معانی میں آزاد کنندہ' آزاد شدہ غلام' حلیف' ابن عم' عصبہ اور وارث شامل ہیں' ہر معنی عبارت کے ربط اور سیاق و سباق سے متعین ہوتا ہے۔ اس آیت میں موالی سے مراد وارث ہیں' یعنی ایسے لوگ جنہیں ترکہ (وراثت) پر غلبہ و استیلاء کا حق پہنچتا ہے' گویا یہاں اس لفظ ولایت سے مراد قرابت اور استحقاقِ وراثت کا قرب مراد ہے۔ مِمَّا تَرَكَ' یعنی وہ مال متروک کے وارث ٹھہرائے گئے ہیں۔ ﴿وَالَّذِيْنَ

عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ﴾ یہاں اس سے مراد ازواج (جوڑے' خاوند اور بیوی دونوں) ہیں' کیونکہ عقد نکاح کے باعث دونوں کو باہم حق وراثت پہنچتا ہے اور عموماً اس عقد کے بغیر وہ باہم وارث نہیں بنتے۔ اَیْمَانُکُمْ کا لفظ اس لیے استعمال ہوا کہ عقد (بیع وشراء' باہمی عہد وغیرہ) میں متعارف یہ ہے کہ بات پختہ ہونے پر باہم دائیں ہاتھ سے مصافحہ کرتے ہیں۔

پس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ جس طرح ہم نے مردوں اور عورتوں کے لیے کام کے دائرے' کسب کار کے حلقے اور فطری مواہب مقرر کر دیے ہیں' جس میں انہیں ایک دوسرے پر حسد وبغض بالکل منع ہے' اسی طرح ہم نے ان کے وراثت میں بھی اپنے اپنے حصے مقرر کر دیے ہیں' تاکہ توازنِ معاشرت قائم رہے اور جس طرح ہر مرد وعورت دوسروں کے وارث ہوئے ہیں' اسی طرح درج ذیل دوسرے وارث بھی ان کی وراثت حاصل کرتے ہیں: (ا) والدین (ب) قرابت دار (ج) زوجین (میاں بیوی) ان میں سے ہر ایک کو ان کا مقرر شدہ حصہ دے دو۔ اللہ تعالیٰ ترکہ (وراثت) اور دوسرے مالی معاملات میں تمہارے تصرفات کو دیکھ رہا ہے' پس ایک دوسرے کا مال کھانے سے مکمل پرہیز کرو اور اس کی جواب دہی پر اللہ سے ڈرو اور ہر ایک کا مقرر کردہ حصہ اسے لازماً ادا کرو۔ ایک دوسری تفسیر کے مطابق ﴿اَلَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اصطلاح میں موالی المولات کہلاتے ہیں۔ قدیم عرب میں دستور تھا کہ دو شخص باہم قول وقرار کر کے ایک دوسرے کے اس طرح سے دوست اور مددگار ہو جاتے کہ اگر ایک پر دیت لازم آئے تو دوسرا اسے ادا کرے اور اگر ایک کی وفات ہو تو وہ دوسرا اس کی میراث پائے۔ اسی باہمی عہد کو عقد موالات کہتے ہیں۔ ابتدائے شریعت میں تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اس دستور کو قائم رکھا گیا۔ انصار ومہاجرین میں باہمی مواخات قائم کر کے باہمی میراث بھی جاری ہو گئی' بعد میں اس عہد والے کا حصہ ۱/۶ متعین ہوا۔ آخر جب سورۃ الاحزاب کی آیت ﴿وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ﴾ نازل ہوئی تو سب ورثاء کے حصے مقرر ہو گئے اور دوسروں کے لیے کوئی گنجائش نہ رہی (جس کا کوئی شرعی وارث نہ ہو' علم میراث میں بیان کردہ شرائط اور تفصیل کے مطابق اب بھی مولی الموالات اس کا وارث بن سکتا ہے)۔ (۲۰)

چند اہم مسائل میراث

وراثت کے درج ذیل تین ارکان ہیں: (ا) مورث' وہ شخص جو کہ ترکہ چھوڑ کر انتقال کر گیا ہو۔ (ب) وارث' وہ افراد جو شرعی لحاظ سے مرنے والے کے ترکہ میں حصہ دار ہیں۔ (ج) ترکہ' کسی شخص کی وفات کے بعد اس کی تمام (منقولہ وغیر منقولہ) جائیداد اور مال ودولت جو شرعی طور پر اس کی ملکیت ہو۔ چند اہم احکامِ وراثت درج ذیل ہیں:

(ا) میت کے بدن کے کپڑے بھی ترکہ میں شامل ہوتے ہیں' لہٰذا ان کو حساب میں لگائے بغیر یونہی صدقہ کر دیا

جاتا ہے۔ بعض علاقوں میں تانبے' پیتل کے برتن میراث تقسیم کیے بغیر فقیروں کو دے دیتے ہیں' حالانکہ ان سب میں نابالغوں اور غیر حاضر وارثوں کا بھی حق ہوتا ہے۔ شرعی طریقہ کار کے مطابق پہلے ورثاء میں میراث تقسیم کرلیں اور ان کو اپنے اپنے حصے دے دیں' اس کے بعد اپنی خوشی سے جو وارث چاہے' مرنے والے کی طرف سے صدقہ وخیرات کرے یا مل کر صدقہ کرنا ہو تو صرف بالغین کریں' نابالغ کی اجازت کا اعتبار نہیں' اور جو وارث غیر حاضر ہو اس کے حصے میں سے اس کی اجازت کے بغیر تصرف درست نہیں ہے۔

(۲) میت کو قبرستان لے جاتے ہوئے جو چادر جنازے کے اوپر ڈالی جاتی ہے' وہ کفن میں شامل نہیں ہے۔ اس کو میت کے مال سے خریدنا جائز نہیں' کیونکہ وہ مال مشترک ہے' اس پر کوئی شخص اپنی طرف سے خرچ کر دے تو جائز ہے۔ بعض علاقوں میں نماز جنازہ پڑھانے والے کے لیے کفن کے کپڑے سے ہی مصلّٰی تیار کیا جاتا ہے اور پھر اسے امام کو دے دیا جاتا ہے۔ یہ خرچ بھی کفن کی ضرورت سے بڑھ کر ہے' اس لیے ورثہ کے مشترک مال سے اس کا خریدنا جائز نہیں۔

(۳) بعض جگہ میت کے غسل کے لیے نئے برتن خریدے جاتے ہیں اور پھر ان کو توڑ دیا جاتا ہے۔ اول تو نئے خریدنے کی ضرورت نہیں' گھر کے برتنوں سے غسل دیا سکتا ہے اور اگر خریدنے کی ضرورت پڑ ہی جائے تو پھر توڑنا جائز نہیں۔ ایک تو اس میں مال کا ضائع کرنا ہے اور دوسرے ان سے یتیموں اور غائب وارثوں کا حق وابستہ ہے۔

(۴) ترکہ کی تقسیم سے پہلے اس میں سے مہمانوں کی خاطر تواضع اور صدقہ وخیرات کچھ جائز نہیں' اس طرح کے صدقہ وخیرات سے متوفی کو کوئی ثواب نہیں پہنچتا' بلکہ ثواب سمجھ کر دینا اور بھی زیادہ سخت گناہ ہے۔ مورث کی وفات کے بعد اب یہ سب مال تمام وارثوں کا حق ہے اور ان میں یتیم بھی ہوتے ہیں' لہٰذا اس مشترک مال سے دینا ایسے ہی ہے جیسے کہ کسی کا مال چرا کر میت کے حق میں صدقہ کر دیا جائے۔ طریقہ یہ ہے کہ پہلے تمام ترکہ ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے' اس کے بعد وہ اپنے مال میں سے اپنی مرضی سے مرنے والے کے حق میں صدقہ وخیرات کریں' تو اس کا ان کو اختیار ہے۔

(۵) تقسیم میراث سے پہلے ورثاء سے اجازت لے کر بھی مشترکہ میراث سے خرچ نہ کیا جائے' اس لیے کہ جو ان میں یتیم ہیں' ان کی اجازت تو معتبر ہی نہیں' اور جو بالغ ہیں وہ بھی ضروری نہیں کہ خوش دلی سے اجازت دیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ لحاظ یا شرم کی وجہ سے اجازت دینے پر مجبور ہوں اور لوگوں کے طعنوں سے ڈر کر بادلِ نخواستہ ہامی بھرلیں۔ شریعت میں تو صرف وہی مال حلال ہے جو کہ دینے والا طیب خاطر سے دے رہا ہو۔

یہاں ایک بزرگ کا واقعہ پیش خدمت ہے' جس سے مسئلہ اور زیادہ واضح ہو جائے گا۔ یہ بزرگ ایک مسلمان بھائی کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر مریض کے پاس بیٹھے تھے کہ اس کا وقت آخر آ گیا۔ اس موقع پر جو چراغ جل رہا تھا' وہ انہوں نے فوراً بجھا دیا' اپنے پاس سے پیسے دے کر تیل منگوایا اور

روشنی کی۔لوگوں نے ان بزرگ سے اس کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ جب تک یہ شخص زندہ تھا' چراغ اس کی ملکیت میں تھا اور اس کی روشنی استعمال کرنا درست تھا۔ اب یہ دنیا سے رخصت ہو گیا تو اس کی ہر چیز وارثوں کی ملکیت میں آ گئی' اب سب وارثوں کی اجازت سے ہی یہ چراغ استعمال ہو سکتا ہے اور وہ سب یہاں موجود نہیں ہیں' اس لیے اپنے پیسوں سے تیل منگوا کر روشنی کی۔

(۶) میراث کی تقسیم نسبی قرابت اور 'الاقرب فالاقرب' کے اصول پر رکھی گئی ہے' لیکن اس میں بعض چیزیں مستثنیٰ ہیں۔ مورث اور وارث ایک ہی دین والے ہونے چاہئیں' دو مختلف دین والے نہ ہوں۔ مسلمان کسی کافر اور کافر کسی مسلمان کا وارث نہ ہوگا' خواہ ان میں باہمی نسبی رشتہ ہی کیوں نہ ہو۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

((لَا یَرِثُ الْمُسْلِمُ الْکَافِرَ وَلَا الْکَافِرُ الْمُسْلِمَ)) (۲۱)

''مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا۔''

یہ حکم اس صورت سے متعلق ہے جبکہ پیدائش کے بعد سے ہی کوئی شخص مسلمان یا کافر ہو' لیکن اگر کوئی شخص پہلے مسلمان تھا' پھر العیاذ باللہ مرتد ہو گیا' تو ایسا شخص اگر مر جائے یا مقتول ہو جائے تو اس کا وہ مال جو حالت اسلام میں کمایا گیا تھا' اس کے مسلمان وارثوں کو ملے گا' اور جو ارتداد کے بعد حاصل ہوا ہو' وہ بیت المال میں جمع کر دیا جائے گا۔ لیکن اگر عورت مرتد ہو گئی ہو تو اس کا کل مال خواہ حالت اسلام میں حاصل ہوا یا حالت ارتداد میں' اس کے مسلمان وارثوں کو ملے گا۔ لیکن خود مرتد' خواہ مرد ہو یا عورت' اس کو نہ کسی مسلمان سے میراث ملے گی اور نہ کسی مرتد سے۔

(۷) اگر کوئی شخص کسی ایسے آدمی کو قتل کر دے جس کے مال سے اس کو میراث پہنچتی ہو تو یہ قاتل اس آدمی کی میراث سے محروم رہے گا۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((اَلْقَاتِلُ لَا یَرِثُ)) (۲۲) ''قاتل وارث نہیں ہوگا''۔ البتہ قتل خطا کی بعض صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔

(۸) اگر کسی شخص نے مرتے وقت اپنی کچھ اولاد چھوڑی اور بیوی کے پیٹ میں بھی بچہ ہے' تو یہ بچہ بھی ورثاء کی فہرست میں داخل ہوگا۔ اس صورت میں اگر حقیقت حال جاننے میں دشواری ہو کہ لڑکا ہے یا لڑکی یا ایک سے زیادہ بچے ہیں' تو پھر بچے کی پیدائش تک تقسیم میراث ملتوی رکھنا مناسب ہوگا۔ اور اگر تقسیم میراث زیادہ ہی ضروری ہو تو سردست ایک لڑکا یا ایک لڑکی فرض کر کے دونوں کے اعتبار سے دو صورتیں فرض کی جائیں' ان دونوں صورتوں میں سے جس میں ورثاء کو کم مال ملتا ہو' وہ ان میں تقسیم کر دیا جائے اور باقی وضع حمل تک کے لیے رکھا جائے۔

(۹) جس شخص نے اپنی بیوی کو طلاق رجعی دی' پھر رجوع کرنے اور عدت ختم ہونے سے پہلے فوت ہو گیا' تو یہ عورت میراث میں حصہ پائے گی' کیونکہ نکاح باقی ہے۔ کسی شخص نے مرض الوفات میں اپنی بیوی کو طلاقِ بائن یا مغلظہ دی اور عدت ختم ہونے سے پہلے اس کا انتقال ہو گیا' تب بھی وہ عورت اس شخص کی وارث ہوگی۔ عورت کو وارث بنانے کی وجہ سے دونوں عدتوں میں سے جو زیادہ دراز ہو' اسی کو اختیار کیا جائے گا۔ دو عدتوں کی مختصر تشریح

یہ ہے کہ عدتِ طلاق تین حیض ہے اور عدتِ وفات چار مہینے دس دن۔ ان دونوں عدتوں میں سے جو عدت زیادہ دن کی ہو‘ اسی کو اس عورت کی عدت قرار دیا جائے گا‘ تاکہ ممکنہ حد تک اس کو حصہ مل سکے۔ لیکن جس شخص نے مرض الوفات سے پہلے اپنی بیوی کو طلاق بائن یا مغلظہ دی اور اس کے کچھ دن بعد عورت کی عدت کے دوران اس کی وفات ہوگئی‘ تو اس صورت میں عورت کو میراث میں سے حصہ نہیں ملے گا‘ البتہ اگر طلاق رجعی دی گئی ہو تو عورت وارث ہوگی۔ اگر کسی عورت نے شوہر کے مرض الوفات میں خود اس سے خلع حاصل کر لیا‘ تو وہ اس کی وارث نہیں ہوگی‘ اگرچہ اس کی عدت کے دوران شوہر انتقال کر جائے۔

(۱۰) شریعت اسلامی میں کسی وارث کو کسی بھی وجہ سے جائیداد سے عاق کرنے کا کوئی تصور نہیں‘ نہ ہی ان مروّجہ عاق ناموں کی کوئی حیثیت ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

((مَنْ فَرَّ مِنْ مِيْرَاثِ وَارِثِهٖ قَطَعَ اللّٰهُ مِيْرَاثَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) (۲۳)

’’جو شخص اپنے وارث کو ترکہ (وراثت) دلانے سے بھاگے‘ تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اسے جنت کی میراث نہ دے گا۔‘‘

البتہ اگر واقعتاً کوئی بہت ہی تکلیف دہ اور حساس معاملہ ہو تو اس کا شرعی حل یہ ہے کہ اپنی زندگی میں ہی مال وجائیداد کو دیگر ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے‘ تاکہ نہ میراث بچے اور نہ ہی اسے تقسیم کرنے کا سوال پیدا ہو‘ البتہ اُخروی جواب دہی کو مدنظر رکھا جائے۔

(۱۱) سورۃ النساء کی آیت گیارہ کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ ۚ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۱۱﴾

’’تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے‘ تم نہیں جانتے کہ ان میں سے تمہیں نفع پہنچانے میں کون زیادہ قریب ہے (زیادہ نفع پہنچانے والا ہے)۔ یہ حصے مقرر ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ بے شک اللہ تعالیٰ (تمہاری مصلحتوں کو) جاننے والا‘ حکمت والا ہے۔‘‘

مفہوم یہ ہے کہ تم نہیں جانتے کہ اصول وفروع میں سے تمہارے لیے زیادہ فائدہ مند کون ہے‘ اس لیے وراثت کے حصے اللہ تعالیٰ نے ہی مقرر کیے ہیں اور وہی اس کی حکمتیں جانتا ہے۔ اگر بندوں کی رائے پر تقسیم ہوتی تو لوگ نفع رساں ہونے کو مدارِ تقسیم بناتے۔ لیکن اس کا یقینی علم بندوں کے لیے مشکل ہے کہ حقیقی نفع رساں ان کے لیے کون ہے‘ اس لیے اقربیت کو مدارِ تقسیم بنایا گیا ہے۔

قرآن پاک کی اس آیت سے یہ واضح ہوگیا کہ میراث کے جو حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں‘ وہ طے شدہ حکم ربی ہے‘ اس میں کسی دوسرے کو اپنی رائے دینے یا ان میں کمی بیشی کرنے کا قطعاً کوئی حق نہیں پہنچتا‘ پوری شرح صدر کے ساتھ اسے تسلیم کرنا چاہیے۔ اس تناظر میں یہ حدیث ماقبل گزر چکی ہے: ’’جو شخص اپنے وارث کا حصہ کاٹے‘ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا حصہ جنت سے کاٹیں گے‘‘۔ (سنن ابن ماجہ)

اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق کے لیے تقسیم میراث کا حکم بہترین حکمت اور مصلحت پر مبنی ہے‘ اس لیے کہ اس کا کوئی حکم حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ انسان اپنے نفع اور نقصان کی حقیقی پہچان حاصل نہیں کر پاتا‘ اس لیے تقسیم میراث کا مسئلہ اگر اس کی رائے پر چھوڑ دیا جاتا تو وہ اپنی کم فہمی کی وجہ سے صحیح اور عادلانہ فیصلہ نہ کر پاتا اور یوں میراث کے حصوں میں بے اعتدالی اور بے انصافی ہو جاتی۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے بندوں کی بھلائی کرتے ہوئے یہ فریضہ اپنے ذمہ لیا‘ تاکہ مال و جائیداد کی تقسیم میں عدل و انصاف کی پوری پوری رعایت ہو اور متوفی کا ترکہ عادلانہ طور پر اس کے ورثاء کے درمیان گردش کرے۔ اس بات پر انسان کو اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا چاہیے‘ نہ کہ وہ وراثت کے حصوں اور اس کی تقسیم میں مین میخ نکال کر اور اعتراض کر کے گناہگار ہو۔

(۱۲) سورۃ النساء کے دوسرے رکوع میں ورثاء کے حصوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

﴿مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾﴾

’’جبکہ وصیت جو کی گئی ہو‘ (وہ) پوری کر دی جائے اور قرض جو میت نے چھوڑا ہو‘ ادا کر دیا جائے‘ بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہوں‘ یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے‘ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا‘ بردبار ہے۔‘‘

یہاں وراثت کی تقسیم سے قبل وصیت پوری کرنا اور پھر قرض ادا کرنے کا حکم ہے‘ لیکن ضابطہ شرعی میں قرض کا ادا کرنا‘ نفاذِ وصیت سے مقدم ہے۔ اگر تمام مال قرض کی ادائیگی میں خرچ ہو جائے‘ تو نہ وصیت نافذ ہوگی اور نہ ہی میراث کا سلسلہ چلے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس ضمن میں وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ’’آپ حضرات یہ آیت تلاوت کرتے ہیں: ﴿مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ﴾ اس میں اگرچہ لفظ وصیت مقدم ہے‘ لیکن عملی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دَین (قرض) کے بعد رکھا ہے (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)۔

اب یہ نکتہ کہ اگر عملاً وصیت مؤخر ہے تو لفظاً اس کو دَین (قرض) سے پہلے کیوں بیان کیا گیا‘ اس بارے میں صاحبِ روح المعانی لکھتے ہیں:

’’آیت میں دَین (قرض) پر وصیت کی تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ میراث کی طرح بغیر کسی عوض کے ملتی ہے اور اس میں رشتہ دار ہونا بھی ضروری نہیں‘ اس لیے وارثین کی جانب سے اس کو نافذ کرنے میں کوتاہی ہونے یا دیر ہو جانے کا قوی اندیشہ تھا‘ اپنے مورث کا مال کسی کے پاس جاتا دیکھنا ان کو ناگوار ہو سکتا تھا‘ اس لیے شان وصیت کا اہتمام فرماتے ہوئے دَین پر اس کو مقدم رکھا گیا۔ پھر یہ بھی بات ہے کہ قرض کا ہر میت پر ہونا ضروری نہیں‘ اور اگر زندگی میں رہا ہو تو موت تک باقی رہنا ضروری نہیں‘ اور اگر موت کے وقت (قرض) باقی بھی ہو‘ تو چونکہ اس کا مطالبہ حق دار کی طرف سے ہوتا ہے‘ اس لیے ورثاء بھی انکار نہیں کر سکتے‘ اس وجہ سے اس میں کوتاہی کا احتمال بہت کم ہے‘ بخلاف وصیت کے کہ جب مرنے والا مال چھوڑتا ہے‘ تو اس کا یہ بھی دل چاہتا ہے کہ صدقہ جاریہ کے طور پر اپنے مال کا حصہ کسی کارِ خیر میں صرف کر جائے‘ (اب) چونکہ اس مال کا کسی طرف سے مطالبہ نہیں ہوتا‘ اس لیے وارثوں کی طرف سے کوتاہی کا امکان تھا‘ جس کا سدباب کرنے کے لیے ہر جگہ بطور خاص وصیت کو مقدم رکھا گیا۔‘‘(۲۴)

یہاں 'غَیْرَ مُضَآرٍّ' کا مطلب یہ ہے کہ مرنے والے کے لیے وصیت یا دَین (قرض) کے ذریعے وارثوں کو نقصان پہنچانا جائز نہیں۔ وصیت کرنے کی یا اپنے اوپر قرض کا فرضی اقرار کرنے میں وارثوں کو محروم کرنے کا ارادہ ہونا اور اس ارادے پر عمل کرنا سخت ممنوع اور گناہ کبیرہ ہے۔

قرض یا وصیت کے ذریعے نقصان پہنچانے کی کئی صورتیں ممکن ہیں' مثلاً یہ کہ قرض کا جھوٹا اقرار کرلے' کسی دوست کو مال دلانے کے لیے یا اپنے مخصوص مال کو جو اس کا ذاتی ہے' یہ ظاہر کردے کہ فلاں شخص کی امانت ہے' تاکہ اس (مال) میں میراث نہ چلے' یا ایک تہائی مال سے زائد کی وصیت کرے' یا کسی شخص پر اس کا قرض ہو اور وہ وصول نہ ہوا ہو' لیکن جھوٹ اور غلط بیانی سے یہ کہہ دے کہ اس سے قرض وصول ہوگیا' تاکہ (وہ مال) وارثوں کو نہ مل سکے' یا مرض الوفات میں اپنے مال و جائیداد کے ایک تہائی سے زیادہ کسی کو ہبہ کردے (تحفے میں دے دے)' وغیرہ۔ یہ تمام صورتیں ضرر پہنچانے کی ہیں' ہر دنیا سے جانے والے مورث کو زندگی کے آخری لمحات میں اس طرح کے اقرار سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہیے' اور اُخروی محاسبے کی فکر ہونی چاہیے۔

یہ بات ذہن نشین کرنی ضروری ہے کہ جس شخص کے ذمے دوسرے لوگوں کے حقوق واجب ہوں یا اس کے پاس کسی کی امانت رکھی ہو' اس پر ان تمام چیزوں کی ادائیگی کے لیے وصیت کرنا واجب ہے۔ حضور پاک ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا کہ جس شخص کے ذمے کچھ لوگوں کے حقوق ہوں' اس پر تین راتیں ایسی نہ گزرنی چاہئیں کہ اس کی وصیت لکھی ہوئی اس کے پاس موجود نہ ہو۔

میراث کے حصے بیان کرنے کے بعد ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ﴾ ''یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے''۔ یعنی جس جس کے اور جتنے حصے مقرر کیے گئے' اور قرض اور وصیت کے بارے میں جو تاکید کی گئی' اس سب پر عمل کرنا نہایت ضروری ہے۔ یہ اللہ پاک کی طرف سے ایک عظیم نصیحت (وصیت) اور مہتم بالشان حکم ہے' اس کی تم قطعاً خلاف ورزی نہ کرنا۔ آگے مزید تنبیہ کرتے ہوئے بیان ہوتا ہے: ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝۱۲﴾ ''اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور تحمل کرنے والا ہے''۔ یعنی اس نے اپنے علم سے ہر ایک کا حال جانتے اور سمجھتے ہوئے (وراثت کے) حصے مقرر فرمائے ہیں۔ جو احکامِ مذکورہ پر عمل کرے گا' اللہ کے علم سے اس کی یہ نیکی باہر نہ ہوگی' اور جو اس کی خلاف ورزی کرے گا' اس کی بدکرداری بھی اللہ کے علم میں آجائے گی' جس کی پاداش میں اس سے کڑا محاسبہ اور مواخذہ کیا جائے گا۔ اس طرح جو کوئی مرنے والا دَین (قرض) یا وصیت کے ذریعے حصہ داروں کو نقصان پہنچائے گا' اللہ کو اس کا بھی علم ہے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حلیم ہونے کی بنا پر اس دنیا میں اسے سزا نہ دے۔ اس سے خلاف ورزی کرنے والے کو اس دھوکے میں نہیں آنا چاہیے کہ میں سزا سے بچ گیا' آخرت کے مواخذے' پکڑ اور بدلے سے وہ کسی صورت بھی نہیں بچ پائے گا۔

(۱۳) ایک آدمی کی وصیت میں ضرر رسانی یہ ہے کہ ایسے طور پر وصیت کی جائے جس سے مستحق رشتہ داروں کے حقوق تلف ہوتے ہیں اور اس کی قرض میں ضرر رسانی یہ ہے کہ محض حق داروں کو محروم کرنے کے لیے خواہ مخواہ

اپنے اوپر ایسے قرض کا اقرار کرے جو اس نے فی الواقع نہ لیا ہو‘ یا کوئی ایسی چال چلے جس سے یہ مقصود ہو کہ حقدار اپنے حصہ میراث سے مرحوم ہو جائیں‘ اس قسم کے ضرار (ضرر رسانی) کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔ ایسی وصیت باطل اور حرام بھی ہوگی‘ اسے نافذ نہیں کیا جائے گا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ وصیت میں نقصان رسانی بڑے (کبیرہ) گناہوں میں سے ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الرَّجُلَ لَیَعْمَلُ وَالْمَرْاَۃُ بِطَاعَۃِ اللّٰہِ سِتِّیْنَ سَنَۃً ثُمَّ یَحْضُرُھُمَا الْمَوْتُ فَیُضَارَّانِ فِی الْوَصِیَّۃِ فَتَجِبُ لَھُمَا النَّارُ))(۲۵)

’’مرد ہو یا عورت ساٹھ سال تک اللہ کی عبادت کرتے ہیں‘ پھر جب ان کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو وہ وصیت کر کے وارثوں کو نقصان پہنچاتے ہیں‘ پس ان کے لیے جہنم واجب ہو جاتی ہے۔‘‘

ایک اور موقع پر فرمانِ نبویؐ ہے‘ جس کا بیان ماقبل ہو چکا‘ کہ: ’’جو شخص اپنے وارث کو میراث سے محروم کرے گا‘ اللہ تعالیٰ اس کو جنت سے محروم فرما دیں گے۔‘‘

(اس عنوان کی تیاری میں معارف القرآن از حضرت مفتی محمد شفیعؒ سے سورۃ النساء کی آیات ۷ تا ۱۲ کی تشریح اور معارف و مسائل‘ تفہیم القرآن از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۰ اور سورۃ النساء کی آیت ۱۲ کی تشریح‘ نیز مفید الوارثین از حضرت مولانا سید میاں صاحب اصغر حسینؒ طبع ادارہ اسلامیات‘ کراچی‘ جدید ایڈیشن ۱۳۳۴ھ سے مدد لی گئی ہے۔)

(مضمون کا بقیہ حصہ اور مکمل حواشی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں) ❁❁❁

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
☆ اردو اور انگریزی کتابیں
☆ آڈیو ویڈیو کیسٹس رسی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah Al-Ma'idah

(The Repast / The table laden with food)

(Recap of verses 87 – 100 of Surah Al-Ma'idah and fresh exposition of verses 101 – 120 of the same Surah, inclusive)

Translator's note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Ayah) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQuran.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.

Recap of verses 87 – 100 of Surah 5, Al-Ma'idah

The reader would recall that we had concluded our exposition of verses 87 – 100 of Surah Al-Ma'idah in the previous issue of Hikmat e Qur'an. A brief recap of the exposition follows:

Main Themes of verses 87 – 100:

Verses 87-89: Do not make Halal things Haram on your own and *Kaffarah* (penalty) for breaking the oath…

Verses 90-93: Prohibition of intoxicants (liquor and drugs) and gambling and the Prophet's *(SAAW)* duty is only to pass on the Message of Allah *(SWT)*…

Verses 94-96: Prohibition of hunting game in the state of Ihram (wearing pilgrim garb for Hajj and Umrah) and *Kaffarah* (penalty) for hunting game in the sate of Ihram (wearing pilgrim garb for Hajj and Umrah)…

Verses 97-100: Identification and significance of the sacred rituals of Hajj…

Verse 87: In this verse, Allah (SWT) gives the commandment to not to exaggerate in religion (The Deen of Islam) and make it difficult for Muslims to follow in their everyday lives. This normally occurs when Muslims (including *Ulema*) start giving decrees on the basis of their doubts and whims about *Halal (lawful)* and *Haram (un-lawful)* by even prohibiting those things which Allah (SWT) has made lawful and hence fall into the trap of extravagance. Muslims are required to accept wholeheartedly what Allah (SWT) has made lawful with gratitude and abstain from whatever He (SWT) has made unlawful, as enunciated in the Qur'an and the Ahadith of the Holy Prophet (SAAW).

Verse 88: The meaning of the verse is self-evident, when He (SWT) decrees that Muslims ought to eat all the pure and lawful things that Allah (SWT) has made lawful for them. The essence of the verse is that Muslims must always remain conscious of Allah (SWT) in Whom (SWT) they believe, by fulfilling His (SWT) commandments and obeying Him (SWT) sincerely.

Verse 89: Unintentional oaths imply what is sworn only out of habit of speech or what one utters carelessly without true intent. This verse deals in more detail about deliberate (intended) oaths. In this verse, Muslims are told not to take intended oaths indiscriminately or swear to do that which is sinful, requiring expiation. The verse describes the expiation for breaking one's deliberate oaths. Allah (SWT) directs the Muslims to be mindful of oaths and pay their expiation in case of breaking them. In this way Allah (SWT) explains His (SWT) revelations and makes clear His (SWT) signs to the mankind, so that they are grateful to Him (SWT).

Verse 90: In this verse Allah (SWT) manifestly prohibits the believers from:

- The consumption of intoxicants,
- Gambling,
- Dedication (sacrificing) on stone alters to other than Allah (SWT), and
- Making decisions by raffling of arrows.

The verse declares that the four actions mentioned above (and the likes of them) are "filthy" deeds and ascribes them to the revolting actions of the accursed Satan.

Verse 91: Picking up from the subject of prohibitions mentioned in verse 90, Allah (SWT) describes in detail that these are the tools of Satan to distract a believer from the worship, belief and remembrance of his one and only Lord – Allah (SWT) - and to stir up hatred and discord among the believers.

Verse 92: In this verse, Allah (SWT) commands His (SWT) servants to obey Him (SWT) and His (SWT) Messenger (SAAW), and abstain from all those things which have been declared as unlawful (*Haram*) and thus prohibited for Muslims. The verse also warns that those who do not obey as required, then they themselves alone will be responsible for the consequences and there will be no blame on the Prophet (SAAW), as his (SAAW) duty is only to convey Allah's (SWT) message clearly to mankind and it is Allah (SWT) alone Who (SWT) guides whomsoever He (SWT) Wills and He (SWT) does not guide those who (keep on) disbelieving in Him (SWT) and His (SWT)

Messengers (AS), hence bringing the Jews and Christians into the picture too along with the Muslims.

Verse 93: This verse makes it clear that Allah (SWT) would forgive (as He *SWT* pleases) those who consumed intoxicants before its prohibition, provided that they had firm faith in Him (SWT) and His (SWT) Messenger (SAAW), which was required of them at the time of their death, and those who were still living kept performing righteous deeds. Moreover, this crucial verse also gives a clear explanation of the three essential elements of Deen: *Islam*, *Iman* and *Ihsan*. Within the three stages the driving force that carries a person from one stage to a higher one is *Taqwa* (fear of Allah *SWT*). In a nutshell, an increase in consciousness and awareness of a believer's duty towards Allah (SWT) also increases his faith, and spiritually takes him up to a loftier level.

Verse 94: Allah (SWT) tests His (SWT) servants with bounties as well as with calamities and afflictions, so that the earnest and sincere believers who fear Him (SWT), although He (SWT) is unseen to them, can be distinguished from those who lack the faith and genuine belief in Him (SWT). In this verse the game refers to the hunting of animals, which is prohibited in state of *Ihram* and it has been used as an example of a "test" from Allah (SWT). Allah (SWT) tests the believers by rendering lawful animals well within their reach prohibited, when they are in the state of *Ihram*. The essence of the verse is a warning to those who transgress and disobey Allah (SWT) even after they have been notified and they pay no heed to it, that they would suffer a painful punishment in the Hereafter due to such attitude and behaviour of betrayal and disbelief.

Verse 95: This verse describes the rulings on the possible alternatives for the expiation of killing an animal while in state of *Ihram*. The verse also states that Allah (SWT) forgives those sins committed during the time of ignorance, but He (SWT) will take retribution from those who are repeat offenders of doing the prohibited, and surely Allah (SWT) is the All-Mighty and capable of taking retribution as He (SWT) pleases.

Verse 96: The verse decrees that those who travel by sea for *Hajj* or *Umrah* are allowed to hunt and eat food from the sea (such as fish)

even if they are in a state of *Ihram* for the Pilgrimage. However, the prohibition of hunting on land for them, too, remains unlawful. In the verse, Allah (SWT) orders His (SWT) servants to remain mindful of their duty towards Him (SWT) at all times and refrain from what He (SWT) has forbidden and made unlawful for them and warns them to remember that they will all be assembled in His (SWT) presence on the Day of Judgement.

Verse 97: The verse enunciates the status of the city of Makkah. Allah (SWT) has declared that the city of Makkah is "sacred", in which war (including mischief and *fasad*) is prohibited, thus ensuring a sense of security not only for those living in the city and its suburbs, but also to all those Muslims from around the world who come to the Holy city for religious or other reasons. Furthermore, Allah (SWT) reminds Muslims of the sanctity of the Sacred month of Pilgrimage *(Dhul-Hijjah)*, so that they refrain from what He (SWT) has prohibited during the Holy month. Allah (SWT) also decrees that the animals sent to the *Ka'bah* for sacrifice and those who have garlands in their necks to mark them off for sacrifice are sacred. The fact is, that Allah (SWT) has made all these "symbols" conspicuous so that they could be a clear sign for mankind to identify and understand Allah's (SWT) religion (the Deen of Islam) and also so that they could know that He (SWT) has Supreme Knowledge of everything.

Verse 98: The verse is self-explanatory and its subject matter appears recurrently throughout the Qur'an. Allah (SWT) is severe in punishment for those who disobey Him (SWT) and reject His (SWT) commandments and He (SWT) forgives and bestows His (SWT) Mercy upon those who keep repenting and doing righteous deeds.

Verse 99: The verse expounds on an extremely important issue viz. the mission and duty of a Prophet (AS). Allah (SWT) clearly defines that the duty of His Messenger (SAAW) is only to give warning (and glad tidings) and convey the message of Allah (SWT) to mankind. As for the audience of the Prophet (SAAW), Muslims and non-Muslims, past or present, Allah (SWT) knows full well all that they hide and all that they reveal. The hiding and revealing part is particularly directed towards the Jews and the Hypocrites (both past, present and future) whose trademark was and is still today deception and betrayal.

Verse 100: In this verse Allah (SWT) tells his Messenger (SAAW) to deliver an admonition to all mankind that anything and everything that is evil cannot be "equal" to anything and everything that is good, even if the "abundance" of evil may be dazzling and due to that factor, humans might get inclined towards it. The verse orders all humans in general and to the Muslims in particular to fear Him (SWT) alone and abstain from all kinds of sins, immoral and evil deeds that He (SWT) has forbidden and perform all kinds of good deeds that He (SWT) has permitted and in many cases ordered, so that they may prosper in this world and in the Hereafter.

==========

Exposition of verses 101 to 120 of Surah Al-Ma'idah

Verse 101

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝

"O you who have believed, do not ask about things which, if they are shown to you, will distress you. But if you ask about them while the Qur'an is being revealed, they will be shown to you. Allah has pardoned it [i.e., that which is past]; and Allah is Forgiving and Forbearing."

People used to ask the Prophet (SAAW) many questions which were of no practical relevance to either religious or day-to-day affairs. Once, for instance, a person asked the Prophet (SAAW) in the presence of a crowd: 'Who is my real father?' Likewise, many people used to ask unnecessary questions about legal matters. By these uncalled for inquiries they sought knowledge of matters which had for good reasons, been deliberately left undetermined by the Law-giver (SWT). In the Qur'an, for example, Pilgrimage had been declared obligatory. A person who became aware of this came to the Prophet (SAAW) and inquired: 'Has it been made obligatory to perform it every year?' To this the Prophet (SAAW) made no reply. When he inquired for the second time the Prophet (SAAW) again stayed silent. On being asked for the third time, he (SAAW) said: 'Pity

on you! Had I uttered "Yes" in reply to your question, it would have become obligatory to perform it every year. And then you would not have been able to observe it and would have been guilty of disobedience.' ***[Ref: Bukhari, Muslim]***

The Prophet (SAAW) discouraged people from being over-inquisitive and unnecessarily curious about every question. We find in the Hadith the following saying from the Prophet (SAAW): 'The worst criminal among the Muslims is the one who inquired about something which had not been made unlawful, and then it was declared so, because of his inquiry.' ***[Ref: Bukhari, Abu Da'ud]***

In both these traditions an important fact has been called to our attention. In matters where the Law-giver (SWT) has chosen to lay down certain injunctions only broadly, without any elaborate details, or quantitative specifications, He (SWT) has done so not because of neglect or forgetfulness. Such seeming omissions are deliberate, and the reason thereof is that He (SWT) does not desire to place limitations upon people, but prefers to allow them latitude and ease in following His (SWT) commandments. Now there are some people who make unnecessary inquiries, cause elaborately prescribed, inflexibly determined and restrictive regulations to be added to the Law. Some others, in cases where such details are in no way deducible from the text, resort to analogical reasoning, thereby turning a broad general rule into an elaborate law full of restrictive details, and an unspecified into a specified rule. Both sorts of people put Muslims in great danger. For, in the area of belief, the more detailed the doctrines to which people are required to subscribe, the more problematic it becomes to do so. Likewise, in legal matters, the greater the restriction, the greater the likelihood of violation.

The final part of the verse enunciates that Allah (SWT) has forgiven those who asked such questions before this prohibition, and surely He (SWT) is Forgiving and Most-Forbearing.

Verse 102

قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كٰفِرِيْنَ ۝

"A people asked such [questions] before you; then they became thereby disbelievers."

Some people first indulged in hair-splitting arguments about their laws and dogma, and thereby wove a great web of creedal elaborations and legal minutiae. Then they became enmeshed in this same web and thus became guilty of dogmatic errors and the violation of their own religious laws. The people referred to here are the Jews, and the Muslims who followed in their footsteps and left no stone unturned, despite the warnings contained in the Qur'an and in the sayings of the Prophet Muhammad (SAAW).

The verse also enunciates that these people also put such unnecessary questions to their Prophets (AS), that when they were given answers it made it so difficult for them that they rejected the answers and consequently became disbelievers.

This verse, in essence, ordains humankind to give up their unwillingness to carry out what has been commanded of them by the Almighty (SWT) and His final Messenger (SAAW).

Verse 103

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنۡۢ بَحِيۡرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيۡلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ ؕ وَاَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ۝

"Allah has not appointed [such innovations as] bahirah or sa'ibah or wasilah or ham. But those who disbelieve invent falsehood about Allah, and most of them do not reason."

Just as, in the Indian subcontinent, cows, oxen and goats are set free after being consecrated either to Allah (SWT) or to some idol or shrine or to some saintly person, and just as people consider it prohibited either to put them to work, to slaughter them or to derive any other kind of benefit from them, so the Arabs of the *Jahiliyah* period also let loose certain animals after consecrating them. Such animals were variously named.

Bahirah was the name of a female camel which had already borne five young, the last of which was a male. The practice was to slit the ear of such a camel and then let her loose. Thereafter no one could ride her, use her milk, slaughter her or shear her hair. She was entitled to graze and drink water wherever she liked.

Sa'ibah was the name of either a male or female camel which had been let loose after consecration as a mark of gratitude in fulfilment of a vow taken for either the recovery from some ailment or delivery from some danger. In the same way the female camel which had borne ten times, and each time a female, was also let loose.

If the first kid born to a goat was a male, it was slaughtered in the name of the deities; but if it was a female, it was kept by the owners for themselves. If twins were born and one of them was a male and the other a female goat, the male was not slaughtered but rather let loose in the name of the deities. This male goat was called *Wasilah*.

If the young of camels in the second degree of descent had become worthy of riding they were let loose. Likewise, if ten offspring had been borne by a female camel she was also let loose, and called *Ham*.

These (*bahirah*, *sa'ibah*, *wasilah* and *ham*) were categories of particular camels which were dedicated by the polytheists to idols and set free to pasture, liberated from the service of man, as a misguided act of worship.

Verse 104

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ۝

"And when it is said to them, "Come to what Allah has revealed and to the Messenger," they say, "Sufficient for us is that upon which we found our fathers (and forefathers)." Even though their fathers knew nothing, nor were they guided?"

In this verse Allah (SWT) states that when the disbelievers are asked to follow His (SWT) religion and follow His (SWT) commandments and those of His Prophet (SAAW), they say that we will only follow our forefathers who worshipped idols and their following is enough for us. So Allah (SWT) asks them: will they still follow their forefathers and imitate their practices even when they know that those whom they follow had no knowledge and guidance?

Verse 105

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝

"O you who have believed, upon you is [responsibility for] yourselves. Those who have gone astray will not harm you when you have been guided. To Allah is your return all together; then He will inform you of what you used to do."

What is stressed in this verse is that rather than occupying himself unduly with examining faults in the belief and conduct of others, a man should pay greater attention to a critical examination of his own conduct. His primary concern should be with his own faith and conduct. If a man is himself obedient to Allah (SWT) and His Messenger (SAAW), observes his duties to Him (SWT) and to His (SWT) creatures including his duty to promote what is good and forbid what is evil, and lives according to the dictates of righteousness and honesty, he has fulfilled his obligation and if others persist either in false beliefs or in moral corruption their errors cannot harm him. This verse in no way means that a man should care only for his own salvation and should remain unconcerned with the reform of others. Abu Bakr (RA) removed this misconception in one of his sermons when he remarked:

"You recite this verse but interpret it erroneously. I have heard the Messenger of Allah (SAAW) say, that when people see corruption but do not try to change it; and when they see a wrong-doer commit wrong but do not prevent him from doing so, it is not unlikely that Allah's (SWT) chastisement will seize them all. By Allah (SWT), it is incumbent upon you that you bid what is good and forbid what is evil or else Allah (SWT) will grant domination upon you to those who are the worst among you. They will greatly chastise you and then when your righteous ones pray to Allah (SWT), their prayers will not be answered."

In essence, the verse ordains that one must always be mindful of the fact that your final goal is to Allah (SWT), Who (SWT) will show you the truth of all that you used to do.

Verse 106

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ۭ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ۝

"O you who have believed, testimony [should be taken] among you when death approaches one of you at the time of bequest – [that of] two just men from among you or two others from outside if you are traveling through the land and the disaster of death should strike you. Detain them after the prayer and let them both swear by Allah if you doubt [their testimony, saying], "We will not exchange it [i.e., our oath] for a price [i.e., worldly gain], even if he should be a near relative, and we will not withhold the testimony of [i.e., ordained by] Allah. Indeed, we would then be of the sinful."

In this verse Allah (SWT) commands His (SWT) servants to take two just witnesses for their final will. They should be from amongst the Muslims and should be men of honor and integrity. In other words, they should be pious, straightforward and trustworthy Muslims. If the beneficiary has any doubts in their truthfulness or integrity then he should detain them after prayers in the mosque and they should testify that they will not sell this testimony for any price, even if it is their own relative and they will not hide or distort, which they have witnessed before Allah (SWT), for if they do so then they will be counted among the sinful. But if a person is traveling through a land and suddenly death comes upon him and he does not find any Muslims to be witnesses for his final will then he has the option to take two non-Muslim witnesses, preferably from amongst the People of the Book. This verse also enunciates that the testimony of non-Muslim witnesses in cases involving Muslims is appropriate only when no Muslim is available as a witness.

Verse 107

فَإِنْ عُثِرَ عَلَىٰٓ أَنَّهُمَا ٱسْتَحَقَّآ إِثْمًا فَـَٔاخَرَانِ يَقُومَانِ مَقَامَهُمَا مِنَ ٱلَّذِينَ ٱسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ ٱلْأَوْلَيَٰنِ فَيُقْسِمَانِ بِٱللَّهِ
لَشَهَٰدَتُنَآ أَحَقُّ مِن شَهَٰدَتِهِمَا وَمَا ٱعْتَدَيْنَآ ۖ إِنَّآ إِذًا لَّمِنَ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿١٠٧﴾

"But if it is found that those two were guilty of sin [i.e., perjury], let two others stand in their place [who are] foremost [in claim] from those who have a lawful right. And let them swear by Allah, "Our testimony is truer than their testimony, and we have not transgressed. Indeed, we would then be of the wrongdoers."

This verse clearly states that if the two witnesses (mentioned in the previous verse) are found guilty of distorting the testimony or stealing from the wealth of the beneficiary, then oaths are taken from two of the nearest rightful owners as witnesses in their place. These two should also swear by Allah (SWT) and affirm that their testimony is "truer" than the other two and that they have not transgressed from the truth, for if they do so, then they will be counted among the evil-doers and will be punishable by Allah (SWT).

Verse 108

ذٰلِكَ اَدۡنٰٓى اَنۡ يَّاۡتُوۡا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجۡهِهَآ اَوۡ يَخَافُوۡۤا اَنۡ تُرَدَّ اَيۡمَانٌۢ بَعۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسۡمَعُوۡا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ ۝

"That is more likely that they will give testimony according to its [true] objective, or [at least] they would fear that [other] oaths might be taken after their oaths. And fear Allah and listen [i.e., obey Him]; and Allah does not guide the defiantly disobedient people."

This verse elaborates the procedure of the testimony mentioned in the previous verses, so that the chances of false evidence could be minimized as much as possible, if not eliminated altogether. The basic premise is to ensure that the witnesses offer their testimony in truth or at least they have fear that their testimony can be abrogated, so they are not tempted to steal anything or hide the truth. The verse ordains that those bearing witness ought to always be mindful of Allah (SWT) and be obedient to Him (SWT), for He (SWT) does not give guidance to those who are disobedient transgressors.

Verse 109

يَوۡمَ يَجۡمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوۡلُ مَاذَاۤ اُجِبۡتُمۡ ؕ قَالُوۡا لَا عِلۡمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُيُوۡبِ ۝

"[Be warned of] the Day when Allah will assemble the messengers and say, "What was the response you received?" They will say, "We have no knowledge. Indeed, it is You who is Knower of the unseen."

The "Day" refers to the Day of Judgement and Resurrection. On That Day, all the Messengers (AS) of Allah (SWT) will be gathered in His

(SWT) presence and they (AS) will be asked about the response of their nations to their teachings. The Messengers (AS) in their humbleness and out of respect to Allah (SWT) will reply that O our Lord (SWT) we have no knowledge compared to Your (SWT) infinite knowledge and You (SWT) perfectly know what our people believed in and what they hid in their breasts as we (AS) only saw what was visible thereof, for it is only You (SWT) who know all that is hidden and all that they revealed. The entire reference here is to the response of the world (the people from Adam *AS* to the last human) to the call of the Prophets (AS) towards Allah's (SWT) *Deen*.

It must be noted that the "reply of the Prophets (AS)" indicates that the Prophets (AS) would say that their knowledge was confined to that limited, outward response which they had encountered during their lifetimes. The true reaction to their call at various places and in different forms would only be known completely to Allah (SWT) Himself alone.

Verse 110

إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ ۘ إِذْ أَيَّدتُّكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۖ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۖ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ ۖ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنكَ إِذْ جِئْتَهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿١١٠﴾

"[The Day] when Allah will say, "O Jesus, Son of Mary, remember My favor upon you and upon your mother when I supported you with the Pure Spirit [i.e., the angel Gabriel] and you spoke to the people in the cradle and in maturity; and [remember] when I taught you writing and wisdom and the Torah and the Gospel; and when you designed from clay [what was] like the form of a bird with My permission, then you breathed into it, and it became a bird with My permission; and you healed the blind [from birth] and the leper with My permission; and when you brought forth the dead with My permission; and when I restrained the Children of Israel from [killing] you when you came to them with clear proofs and those who disbelieved among them said, "This is not but obvious magic."

The initial question mentioned in this verse would be addressed to all Prophets (AS) as such. Then each of them (AS) would be called upon to bear witness separately, as stated in several places in the Qur'an. In this connection the question that will be addressed to Prophet Jesus (AS) is specifically mentioned here. Allah (SWT) will remind Prophet Jesus (AS) of the favors and blessings that He (SWT) bestowed on him (AS) and his mother (Mary *AS*). He (SWT) created Jesus (AS) miraculously without father and exalted his (AS) mother (AS), purified her (AS) and chose her (AS) above the women of all nations and strengthened them and supported them with angel Gabriel (AS). Prophet Jesus (AS) spoke to the people from his cradle defending his mother when they accused Mary (AS) of being unchaste and he (AS) also spoke to them when he reached his maturity.

[Ref: Surah Al-Imran, Verse 46]

Moreover, Allah (SWT) gave Jesus (AS) the knowledge of writing and Wisdom and also that which was given to Moses (AS) along with the knowledge of Injeel. Furthermore, Allah (SWT) will remind him (AS) of His (SWT) favors to him in the form of the miracles that he (AS) performed by His (SWT) permission. These included the miracle whereby Prophet Jesus (AS) brought dead people back to life, with Allah's (SWT) permission. The Children of Israel, however, rejected Jesus (AS) as Allah's Messenger (AS), accused him (AS) of being a magician and tried to crucify him (AS), even though he showed them clear miracles by Allah's (SWT) leave. Therefore, Allah (SWT) saved him (AS) from their plots and raised him (AS) up to heavens.

Editor's Notes:

Note 1: It is worth mentioning that this verse *(Verse 110 of Surah Al-Ma'idah)*, in toto, and particularly the last section of it indisputably provides proof to negate the false claims made by the Jews and Christians about the alleged crucifixion of Prophet Jesus (AS). The matter regarding these false claims is also negated very distinctly in other parts of the Holy Qur'an and the true version of the events is presented in no unclear terms, particularly in verses 157 and 158 of *Surah An-Nisa*, as follows:

a) "And [for] their saying, "Indeed, we have killed the Messiah, Jesus, the son of Mary, the messenger of Allah." And they did not

kill him, nor did they crucify him; but [another] was made to resemble him to them. And indeed, those who differ over it are in doubt about it. They have no knowledge of it except the following of assumption. And they did not kill him, for certain."

[Translation: Surah An-Nisa, Verse 157]

b) "Rather, Allah raised him to Himself. And ever is Allah Exalted in Might and Wise."

[Translation: Surah An-Nisa, Verse 158]

The bottom line is that the Prophet Jesus (AS) was not killed or crucified (as claimed falsely by the Jews and Christians). In fact, Allah (SWT) raised him (AS) to His (SWT) presence. Period.

Note 2:

Moreover, some Muslim scholars deny the second coming of the Christ (Prophet Jesus AS), causing confusion among the ranks of ordinary Muslims. Due to the limit of space, we will resort to providing one testimony from the Holy Qur'an and two from the *Ahadith* of Prophet Muhammad (SAAW) to prove that Prophet Jesus (AS) will most certainly return before the Hour is established and to correct the misguided claims made by those Muslim scholars who refuse to believe in the return of Prophet Jesus (AS) in the "End Times":

"Jesus was not but a servant upon whom We bestowed favor, and We made him an example for the Children of Israel."

"And if We willed, We could have made [instead] of you angels succeeding [one another] on the earth."

"And indeed, Jesus will be [a sign for] knowledge of the Hour, so be not in doubt of it, and follow Me. This is a straight path."

[Translation: Surah Az-Zukhruf, Verses 59 - 61]

It is reported that Prophet Mohammad (SAAW) said: "In the meantime, while the *Dajjal* will be busy doing this and this, Allah will send down the Messiah, son of Mary (Jesus AS). He (Jesus AS) will descend in the eastern part of Damascus, near the white minaret (tower), dressed in the two yellowish garments, with his (AS) hands resting on the arms of two angels. When he (AS) will bend down his (AS) head, water drops will appear trickling down, and when he (AS) will raise it, it will appear as though pearl-like drops are rolling down. Any disbeliever whom the air of his (AS) breath reaches, and it will reach up to the last limit of his (AS) sight, will fall dead. Then, the son of Mary (AS) will go in pursuit of the *Dajjal*, and will overtake him at the gate of *Lud*, and will kill him."

[**Ref***: Sahih Muslim, Tirmizi, Ibn Majah]*

Abu Huraira (RA) reported that Prophet Mohammad (SAAW) said, "By the One (SWT) Whose hands my (SAAW) life is in, surely the Son of Mary (Jesus AS) will descend amongst you as a just ruler. He (AS) will destroy the cross, kill the pig and abolish the *Jizya* (the protection tax levied on Christians & Jews)."

[Ref: *Sahih Bukhari*]

Verse 111

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ۝

"And [remember] when I inspired to the disciples, "Believe in Me and in My messenger [i.e., Jesus]." They said, "We have believed, so bear witness that indeed we are Muslims [in submission to Allah]."

In this verse Prophet Jesus (AS) is being told that the faith of the disciples in him (AS) was also the result of Allah's (SWT) grace and succour, for he, himself, did not have the power to produce even one man of faith in that land of disbelief. *Hawarieen* refers to the disciples of Jesus (AS) who believed in him (AS) and followed his teachings. The verse also makes clear that the true religion of the disciples of Jesus (AS) was Islam. The verse quotes the *Hawarieen* when they said, "we have believed and have submitted ourselves to Allah's (SWT) obedience".

Verse 112

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَاۗىِٕدَةً مِّنَ السَّمَاۗءِ ۭ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

"[And remember] when the disciples said, "O Jesus, Son of Mary, can your Lord send down to us a table [spread with food] from the heaven?" [Jesus] said, "Fear Allah, if you should be believers."

Since the disciples have been mentioned in this verse and the verses prior to it, the continuity of the subject is interrupted momentarily in order to introduce another incident connected with the disciples. This clearly shows that those who had been directly instructed by Prophet Jesus (AS) considered him (AS) merely a human being and a slave of Allah (SWT); they had no conception of their master either being God or a partner of God or the son of God. Jesus (AS) had, rather, presented

himself (AS) to them as a slave of Allah (SWT) with no claims to divine authority. One might feel inclined here to raise the question: What is the occasion for this parenthetical interjection in a conversation that is to take place on the Day of Judgement? This parenthesis, in the opinion of certain exegetes, is not in fact part of such a conversation, but rather forms part of a discussion in this world regarding a conversation that will take place on the Day of Judgement. The conversation that will take place on the Day of Judgement is mentioned here precisely in order that the Christians may derive a lesson from it and direct themselves to the right way. Hence, the mention of this incident regarding the disciples – even though it seems to interrupt the continuity of narration – is in no sense out of place.

In short, the disciples requested Jesus (AS) for a miracle and asked him (AS) to supplicate to His Lord – Allah (SWT) – to send down a table laden with food for them. In reply Jesus (AS) asked them to have fear of Allah (SWT) and not to make such requests, instead show gratitude to Him (SWT) for the provisions that He (SWT) has provided you with, if you are true believers. According to some exegetes, the phrase "fear Allah (SWT)" used by Prophet Jesus (AS) in response to the request made by the disciples was a reference to the fact that when Allah (SWT) most certainly has the unquestionable and undoubted ability to grant the request, then why have doubt in the first place?

Verse 113

قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ۝

"They said, "We wish to eat from it and let our hearts be reassured and know that you have been truthful to us and be among its witnesses."

Continuing from the previous verse, this verse enunciates that the disciples asked Prophet Jesus (AS) for the miracle so that to reassure their hearts and to be stronger in faith. This is, in a way, similar to the request of Prophet Abraham (AS), when he said: "My Lord! Show me how you give life to the dead." He (Allah SWT) replied: "Have you no faith in this?" Abraham said: "Yes! But I ask this to reassure my heart."

[Ref: Surah Al-Baqarah, Verse 260]

Verse 114

قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِّأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِّنكَ ۖ وَارْزُقْنَا وَأَنتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿١١٤﴾

"Said Jesus, the son of Mary, "O Allah, our Lord, send down to us a table [spread with food] from the heaven to be for us a festival for the first of us and the last of us and a sign from You. And provide for us, and You are the best of providers."

Prophet Jesus (AS) fulfilled the request of his (AS) disciples and supplicated to Allah (SWT) to send them a table laden with food (Al-Ma'idah), so that his (AS) followers will take this day as a festival and a sign from Him (SWT). Further he (AS) prayed to Allah (SWT) to give them the best of provisions, for surely He (SWT) is the best of Providers.

Verse 115

قَالَ اللَّهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۖ فَمَن يَكْفُرْ بَعْدُ مِنكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَّا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ ﴿١١٥﴾

"Allah said, "Indeed, I will send it down to you, but whoever disbelieves afterwards from among you – then indeed will I punish him with a punishment by which I have not punished anyone among the worlds."

The Qur'an is silent on the question of whether this meal was sent down in response to this prayer. There is also no other authoritative basis to help us arrive at a clear conclusion. It is possible that the repast was actually sent down. The verse, however, makes it clear that it is the *sunnah* of Allah (SWT) that whenever a nation disbelieves after they have been shown clear signs and miracles by Him (SWT), they are inflicted with severe punishment and wrath. Thus Allah (SWT) states in the verse that after a table laden with food from the heavens descends then whosoever disbelieves will certainly suffer a severe torment in this life and in the Hereafter.

It is possible, according to certain exegetes, that the disciples withdrew their prayer after hearing the stern warning in response to it.

(Allah SWT Knows Best!)

Verse 116

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۱۶﴾

"And [beware the Day] when Allah will say, "O Jesus, Son of Mary, did you say to the people, 'Take me and my mother as deities besides Allah?' "He will say, "Exalted are You! It was not for me to say that to which I have no right. If I had said it, You would have known it. You know what is within myself, and I do not know what is within Yourself. Indeed, it is You who is Knower of the unseen."

The Christians were not content merely with deifying Jesus (AS) and the Holy Spirit. They even turned Mary (AS), the mother of Jesus (AS), into a full-fledged object of worship. The Bible does not contain even the remotest suggestion that Mary (AS) was in any way either divine or superhuman. During the first three centuries after the Messiah's (AS) ascension to the Heavens, such a concept was totally alien to Christian thinking. Towards the end of the third century of the Christian era, however, some theologians of Alexandria employed, for the first time, the expression 'Mother of God' in connection with Mary (AS). It was not until the Council of Ephesus in 431 that the Church officially used the expression 'Mother of God' for Mary (AS). The result was that Mariolatry began to spread fast within the Church itself, so much so that, by the time of the revelation of the Qur'an, Mary (AS) had become so important a deity that she obscured even the Father, the Son and the Holy Ghost. Her statues adorned the cathedrals and she became the object of rites and worship, with people addressing their prayers to her.

The verse clearly states that on the Day of Judgement and Resurrection Allah (SWT) will (initially) take Prophet Jesus (AS) to account (in order to make the case against the real wrongdoers) about the false doctrines that his (AS) followers invented about him (AS), his mother (AS) and Allah (SWT). Prophet Jesus (AS) will disclaim any knowledge of these things attributed to him (AS) or his (AS) mother (AS) and will glorify his (AS) Lord (SWT) with all due humbleness and submissiveness.

Verse 117

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝

"I said not to them except what You commanded me – to worship Allah, my Lord and your Lord. And I was a witness over them as long as I was among them; but when You took me up, You were the Observer over them, and You are, over all things, Witness."

This verse is a continuation of the previous one and illustrates that Prophet Jesus (AS) will further acknowledges that he (AS) was just a mortal, and that his (AS) knowledge was limited like that of a mortal, and he (AS) taught his followers the true teachings of Monotheism and commanded the Children of Israel to worship Allah (SWT) alone, besides whom none is worthy of worship.

Verse 118

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

"If You should punish them – indeed they are Your servants; but if You forgive them – indeed it is You who is the Exalted in Might, the Wise."

All Messengers of Allah (SWT) have been created by the Almighty (SWT) as benefactors of the human race in His (SWT) Infinite Wisdom. This verse is a prime example of that fact. Although Prophet Jesus (AS) will be fully aware of the polytheism of his (AS) followers that they resorted to after him (AS), this verse shows that he (AS) will still entreat Allah (SWT) for a way to save them from the torment of the Hellfire. The fact remains that Allah (SWT) does whatever He (SWT) Wills and He (SWT) is able to do all things. He (SWT) is the Creator (SWT) and Master (SWT) of everything and He (SWT) punishes whoever He (SWT) wishes and pardons whoever He (SWT) likes in His (SWT) perfect Wisdom.

Verse 119

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۭ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

"Allah will say, "This is the Day when the truthful will benefit from their truthfulness." For them are gardens [in Paradise] beneath which rivers flow, wherein they will abide forever, Allah being pleased with them, and they with Him. That is the great attainment."

The illustration of paradise provided in this verse is oft repeated in the Qur'an. The verse is a proclamation of the good news of Paradise for those who always followed the Truth, and also the pleasure of Allah (SWT), the greatest success indeed.

Verse 120

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ۭ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ١٢٠

"To Allah belongs the dominion of the heavens and the earth and whatever is within them. And He is over all things competent."

The subject of this verse is repeated throughout the Qur'an and it clearly demonstrates the Omnipotence, Omnipresence and Omniscience of Allah the Almighty (SWT). To Allah (SWT) belongs the control over the heavens and the earth and all that they contain. He (SWT) has power over all things.

And Allah *(SWT)* Knows Best!

Main Themes of Verses 101 – 120:

Verses 101-104: Do not ask questions like the nation of Musa (Moses *AS*) and Superstitions are prohibited in Islam.

Verses 105-108: Last will and testament of the dying, and testimony of the witnesses.

Verses 109-115: Favors of Allah *(SWT)* upon Jesus *(AS)* and his mother *(AS)*. The miracles he *(AS)* was given and Disciples of Jesus *(AS)* asked for a Table Spread of food (Al-Maid'ah) as a miracle.

Verses 116-120: Testimony of Jesus *(AS)* on the Day of Judgement and Resurrection about/against the Christians.

End of Surah Al-Ma'idah

رسولِ اکرم ﷺ کی عظمت، آپؐ کے مقصدِ بعثت، اسوۂ رسول ﷺ کے قرآنی تصور، سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف گوشوں، خاص طور پر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو جیسے علمی و عملی موضوعات پر 9 کتابوں کا مجموعہ

رسولِ اکرم ﷺ
اور ہم

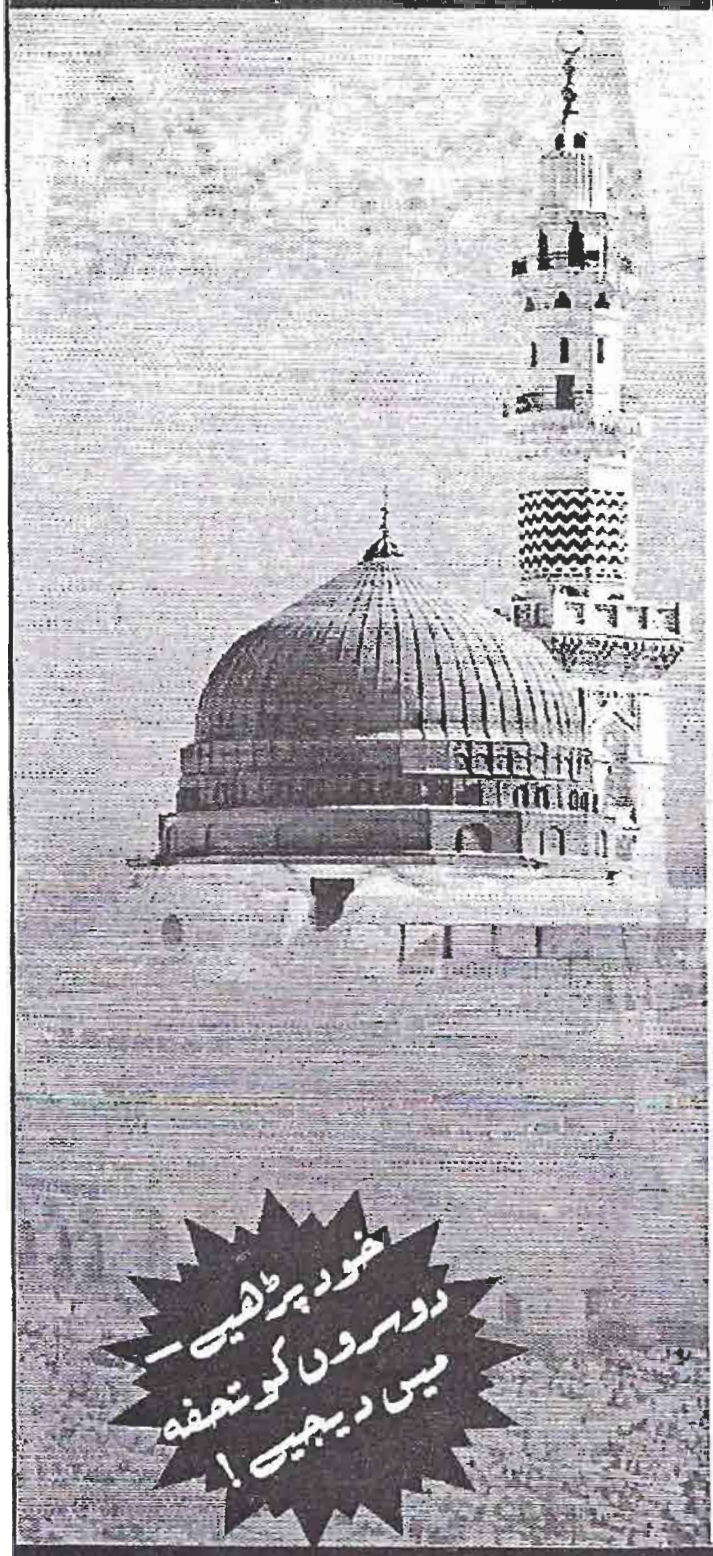

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ

516 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

اشاعت خاص (مجلد):

امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):

امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-35869501-042

maktaba@tanzeem.org

Quarterly
July-Sep. 2018

HIKMAT-E-QURAN

Lahore
Vol. 37 No3

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک بپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دور ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ